مُکّے باز

طاہر جاوید مغل

آنکھوں میں آنسو رواں ہوتے ہیں... غم کے بھی اور خوشی کے بھی... ہر شخص کے پاس آنسوؤں کا خزانہ ہوتا ہے... پوشیدہ آنسو جو پلکوں کے پیچھے اس طرح چُھپے ہوتے ہیں جس طرح ڈرپوک پرندے شکاری کی آہٹ سنتے ہی روپوش ہوجاتے ہیں۔ اس کا وجود بھی یوں کھڑا تھا کہ ایک قدم جوانی کے دائرے میں اور دوسرا بُڑھاپے کے دائرے میں... وقت اور حالات نے اسے ایسے دوراہے پر کھڑا کردیا تھا جہاں صرف موت منتظر تھی... سنگین حالات کے تلاطم نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کردیا تھا... زیرک دشمن نے اپنی دوستی اور دشمنی کی حدوں کو چھوتے ہوئے ایک مسلسل عذاب سے دوچار کردیا تھا... ایک مُکّے باز دلیر باپ کی جرأت مندانہ جدوجہد... غم اور اذیت نے اس کے جذبات کو بھڑکا دیا تھا۔

ایک باکسر کی سحر انگیز زندگی کے طلسماتی کرشمے

زندگی ایک سدا بہتی ندی کا نام ہے۔ یہ بہتی ہے اور موڑ مڑتی رہتی ہے۔ کئی موڑ اتنے حیران کن ہوتے ہیں کہ انسان سمجھ ہی نہیں پاتا۔ مُدام بہتا پانی مسلسل راستے بدلتا ہے اور یہ بدلتے راستے انسان کو ششدر کرڈالتے ہیں۔ عدیل بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ وہ زیادہ تر کروٹ کے بل ہی لیٹتا تھا۔ ایک طرف دیوار پر مرحومہ بیوی کی تصویر تھی۔ وہ کوئی سات برس پہلے زندگی کے سفر میں اسے تنہا چھوڑ کر ایک اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔ موٹروے پر ایک ایکسیڈنٹ...... جس نے اس کی جان لے لی تھی اور عدیل کو قریباً معذور کرڈالا تھا۔ ہاں ان دونوں کی محبت کی نشانی الہام معجزانہ طور پر محفوظ رہی تھی۔ اب اس خالی گھر میں وہی تھی جس کا وجود عدیل کو جینے پر آمادہ کرتا تھا۔

ایک پہلو پر لیٹے لیٹے وہ تھک گیا تو کروٹ بدل لی۔ اب اس کی مرحومہ بیوی سنبل کی تصویر اس کے سامنے تھی۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا اسے لگتا وہ اسے جینے کا حوصلہ دے رہی ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اب اس میں آہستہ آہستہ حوصلہ پیدا ہوتا جارہا تھا۔

وہ احتیاط سے اٹھا...... وال کلاک دوپہر کے ایک بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ ملازمہ راحت آج چھٹی پر تھی۔ تاہم وہ کل ہی کھانا پکا کر فریج میں سلیقے سے رکھ گئی تھی۔ عدیل نے بہت احتیاط سے جھک کر کھانا نکالا اور گرم کرنے

کے لیے کچن میں لے آیا۔ اسی دوران میں کال بیل نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کچھ انتظار کیا جب تیسری مرتبہ بیل ہوئی تو وہ لان پار کر کے دروازے تک پہنچا۔ ''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''جی...... ذرا دروازہ کھولیے۔'' ایک سُریلی آواز نے جواب دیا۔

پنجوں پر کھڑے ہو کر اس نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ ایک خوش رُو لڑکی شال لپیٹے کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال سرما کی سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا۔ ''جی فرمایئے۔'' وہ شائستہ لہجے میں بولا۔

''جی میرا نام تابانہ ہے۔ ہم اسی لین میں تھوڑا آگے رہتے ہیں۔ وہ کارنر والا گھر 28K جس کے گرین شیڈز ہیں۔'' اس کی آواز بھی اس کے نقوش کی طرح تیکھی اور سُبک تھی۔

اس سے پہلے کہ عدیل پھر اپنا سوال دہراتا یعنی جی فرمائیں، کہتا، وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟''

''دراصل میں......'' وہ گڑبڑا گیا۔

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ صرف دو چار منٹ دے دیں۔ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔'' عدیل نے اسے سرتاپا دیکھا۔ وہ معقول ہی نظر آرہی تھی۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ رعایت کے بغیر وہ بہ آسانی ''جواں سال'' کہلا سکتی تھی۔ محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھائیس تیس سال تھی۔ اس نے جس انداز سے اندر آنے کی درخواست کی تھی، عدیل کو راستہ دیتے ہی بنی۔ اس نے شال تو بے شک لے رکھی تھی۔ لیکن نیچے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی بڑی شان سے چلتی عدیل کے ساتھ برآمدے میں آگئی۔ عدیل اسے اس سے آگے لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ دسمبر کی سنہری دھوپ برآمدے میں ایک بڑی سی تکون بنا رہی تھی۔ اس تکون میں بید کی میز اور بید ہی کی تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اندر آنے کے بعد یہ جواں سال خاتون ایک دم پُرجوش نظر آنے لگی تھی۔ اس کی پیشانی تمتما گئی تھی اور خوب صورت آنکھوں میں ایک روشنی سی نمودار ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے چھریرے جسم پر اونی شال درست کی اور بولی۔ ''آپ عدیل صاحب ہیں نا۔ معروف باکسر۔ ایشیائی چیمپئن......'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

عدیل نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ تو ایک پرانی بات ہے۔''

اس نے جیسے عدیل کا فقرہ سنا ہی نہیں۔ اسی پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اسی سوسائٹی کے اسی بلاک میں رہائش رکھتے ہوں گے۔ ہمارے گھر سے بس ساٹھ ستر میٹر کے فاصلے پر...... مجھے...... اپنی نگاہوں پر اب بھی یقین نہیں آرہا کہ میں آپ کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ میں...... آپ کی بہت بڑی فین ہوں سر۔ اور میں ہی نہیں میرے ڈیڈی بھی آپ کے فین تھے۔ بلکہ وہی تھے جن کی وجہ سے میں آپ کی فین بنی۔ ڈیڈی محمد علی کلے کے دور سے باکسنگ کے شیدائی تھے۔ ٹی وی وغیرہ پر وہ باکسنگ کا کوئی مقابلہ مس نہیں کرتے تھے۔ جب پاکستان میں باکسنگ کا REVIVAL شروع ہوا اور پھر آپ جیسے کھلاڑی فوج اور پولیس وغیرہ سے نکل کر منظرِ عام پر آئے تو ڈیڈی کی دلچسپیاں پھر تازہ ہوگئیں۔ آپ نے تو انہیں اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ اسپورٹس کے رسالے ہمارے گھر میں عام آتے تھے۔ ان میں اکثر آپ کی تصویریں بھی چھپتی تھیں۔ میں اس وقت ہائی اسکول کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ایک مرتبہ ایک انٹرنیشنل میگزین میں آپ کی تصویر چھپی تو ڈیڈی خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔ بعد میں، میں نے یہ تصویر کاٹ کر فریم کرائی تھی اور ڈیڈی کو تحفے میں دی تھی۔ وہی والی جس میں آپ نے کورین باکسر کو تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کیا تھا۔'' وہ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی چلی جارہی تھی۔

وہ ذرا سانس لینے کے لیے رکی تو عدیل کو بمشکل مداخلت کا موقع ملا۔ ''آپ نے ابھی تک اپنا پورا تعارف نہیں کرایا؟''

''اوہ سوری، جی میرا پورا نام تابانہ عاطف ہے۔ عاطف میرے ڈیڈی کا نام تھا۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا بزنس، اسپورٹس کا سامان فروخت کرنے کا تھا۔ شاید اسی نسبت سے مجھے بھی اسپورٹس کا شوق پیدا ہوا۔ میں مارشل آرٹ سے وابستہ ہونا چاہتی تھی...... ایک موقع پر تو میں نے باکسر بننے کا ارادہ کر لیا تھا مگر ایک تو باکسنگ لڑکیوں کا کھیل نہیں ہے۔ دوسرے باکسنگ اور کراٹے وغیرہ میں چہرے پر چوٹ لگنے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا میں جوڈو کی طرف راغب ہوگئی۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کر کے اپنے ڈیانا کٹ بالوں کو ہلکورا دے کر پیشانی سے ہٹایا اور

بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں صوبائی سطح کے مقابلوں میں کامیابی سے حصہ لیتی رہی ہوں۔ نیشنل گیمز میں، میں نے سلور میڈل لیا تھا۔ آج کل گلبرگ کے علاقے میں، میں اپنا کلب چلا رہی ہوں۔ فی زمانہ جس قسم کے حالات ہیں، لڑکیوں میں بھی سیلف ڈیفنس کا شعور پیدا ہورہا ہے۔''

عدیل نے اُسے ایک بار پھر سرتا پا دیکھا۔ وہ کُھلے ہاتھ پاؤں کی تھی، اس کی چال ڈھال سے اندازہ ہوا تھا کہ جسم مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ لچک دار بھی ہے۔ کھلاڑیوں کے لیے ایسا ہی جسم چاہیے ہوتا ہے۔ وہ بھی بڑے اشتیاق سے عدیل کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر عدیل پر توصیف و تعریف کے ڈونگرے برسانا شروع کردیے۔ عدیل کو محسوس ہونے لگا کہ شاید اسے اپنے بارے میں خود اتنا معلوم نہیں جتنا وہ جانتی ہے۔ عدیل کا سارا کیریئر اُسے ازبر تھا۔ اس کا مقابلہ کس سن میں، کہاں پر کس سے ہوا؟ کتنے ناک آؤٹ اور کتنے ٹیکنیکل ناٹ آؤٹ ہوئے۔ کچھ فائٹس کی ''اسکورنگ'' تک اسے یاد تھی۔

وہ تمتمائے چہرے کے ساتھ پُرجوش انداز میں بولی۔ ''اگر ڈیڈی زندہ ہوتے تو آپ سے مل کر اور اس طرح آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔'' پھر جیسے ایک دم اسے کچھ یاد آیا۔ ''سر! کہا جاتا ہے کہ ایکسیڈنٹ کے بعد آپ کی کمر پر سخت چوٹ آئی تھی، کچھ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ آپ وہیل چیئر پر آگئے ہیں۔ لیکن آپ تو ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک نظر آرہے ہیں۔''

عدیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہیں کوا کب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ۔ میں اتنا ٹھیک بھی نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے میں مجھے بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے، مخصوص بستر پر سوتا ہوں۔''

''لیکن سر! آپ اس عمر میں بھی کافی جوان اور اسمارٹ نظر آتے ہیں۔'' وہ جیسے بے ساختہ کہہ گئی پھر اس کے چہرے پر سرخ رنگ سا لہرایا اور وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''سر! آج کل تو آرتھوپیڈک اور فزیوتھراپی بہت ایڈوانس ہو چکی ہے۔ آپ بیرونِ ملک...... مم...... میرا مطلب ہے......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے عدیل نے کہا۔ ''یہ ایک کافی پیچیدہ انجری ہے۔ اس کی سرجری وغیرہ بھی آسان نہیں ہوتی۔ بس اسی میں اللہ کا شکر ہے کہ آسانی سے چل پھر لیتا ہوں۔''

اچانک تابانہ عاطف نے اپنی ناک سکیڑی۔ ''سر! کچھ جل تو نہیں رہا؟''

اب عدیل کو بھی کچن کی طرف سے جلنے کی بُو آئی۔ جب ڈور بیل ہوئی تھی، عدیل کھانا گرم کررہا تھا۔ باتوں میں وہ بھول ہی گیا تھا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے کچن میں پہنچا۔ چکن آلو کا سالن تباہ ہورہا تھا۔ اس نے نیپکن پکڑ کر جلدی سے سالن چولھے سے ہٹایا...... تھوڑا سا شوربا اچھل کر اس کے ٹراؤزر اور پاؤں پر گرا۔ چپل پہنی ہوئی تھی پھر بھی بائیں پاؤں کی انگلیوں میں جلن محسوس ہوئی۔ تابانہ بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کچن میں لپک آئی تھی۔ کچن میں دھواں ہورہا تھا۔ تابانہ نے جلدی سے ایگزاسٹ چلایا۔ پھر اس کی نگاہ عدیل کے پاؤں پر پڑی۔ ''اوہ، آپ کے پاؤں پر شوربا گرا ہے۔''

وہ جلدی سے نیچے بیٹھ گئی اور اپنی شال سے عدیل کی چپل صاف کرنے لگی۔ عدیل نے اضطراری طور پر اپنا پاؤں پیچھے ہٹالیا۔

''اوہ سر! آپ کی تو انگلیوں پر بھی سالن گرا ہے۔''

عدیل واقعی جلن محسوس کررہا تھا۔ عدیل کے منع کرتے کرتے اس نے عدیل کی چپل اتاردی اور سرخ ہوتی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ ''کوئی مرہم ہے آپ کے پاس...... میرا مطلب ہے ڈرامازین وغیرہ؟''

عدیل نے کچن کیبنٹ کے ایک بالائی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ہاتھ لمبا کرکے اور پنجوں کے بل کھڑا ہوکے کیبنٹ کا دروازہ کھولا اور مرہم نکال لیا۔ عدیل کچن میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ دو انگلیوں کا بالائی چھلکا تھوڑا، تھوڑا اترا نظر آرہا تھا۔ عدیل نے خود مرہم لگانا چاہا مگر وہ نہیں مانی۔ ''نہیں سر! آپ کو کمر جھکانا پڑے گی۔''

وہ سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ عدیل کا پاؤں احتیاط سے اپنی گود میں رکھا اور پاؤں کے جلے ہوئے حصے پر اپنی انگلی سے مرہم کا لیپ کرنے لگی۔ عدیل کو اب تک بہت پرستار ملے تھے لیکن یہ پرستار کچھ جدا ہی نظر آتی تھی۔ مرہم لگتے ہی عدیل نے اپنا پاؤں اس کی گود سے اتار لیا اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

اپنی باوفا اور ''محبت سے بھرپور شریکِ حیات'' سنبل کی ابدی جدائی کے بعد عدیل کو عورت میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی اب اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ عمر ایسی دلچسپیوں کے لیے مناسب

نہیں ہے۔

''آ...... آپ کے ہاں ملازمہ وغیرہ نہیں ہے؟'' اس نے ذرا حیرانی سے پوچھا۔

''ہے بھئی، لیکن آج چھٹی پر ہے۔''

''ٹھہریں، میں آپ کے لیے کھانا گرم کر دیتی ہوں۔'' اس نے چولہے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

عدیل کے منع کرتے کرتے اس نے ایپرن باندھا اور چولھا پھر سے جلا دیا۔

یہی وقت تھا...... جب گیٹ کی طرف کچھ کھٹ پٹ ہوئی۔ عدیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسے یہ سب کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا اور اب تو اور بھی زیادہ غیر مناسب لگنے لگا تھا۔ عدیل کی بیٹی الہام جو میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی اپنی ''پرسنل کی'' سے بیرونی دروازہ کھولتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ کچن میں تھی۔ کچن میں اپنے پاپا کے ساتھ ایک خاتون کو مصروف کار دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کی سوالیہ نگاہیں عدیل کی طرف اٹھیں، پھر اس کی نگاہ عدیل کے مرہم لگے پاؤں پر پڑی۔

اس نے اپنا اسکول بیگ جلدی سے ایک طرف پھینکا۔ ''اوہ پاپا! یہ کیا ہوا؟ یہ کیسے جل گیا؟'' وہ عدیل کا پاؤں سہلاتے ہوئے بولی۔

عدیل نے مختصراً الہام کو بتایا۔ وہ پریشان نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی سوالیہ نگاہیں تابانہ کی طرف بھی اٹھ رہی تھیں۔ عدیل نے کہا۔ ''یہ ہماری محلے دار ہیں بھئی، دو ڈھائی سال سے یہاں رہ رہی ہیں۔ انہیں آج ہی ہمارا پتا چلا ہے۔ ملنے آ گئی ہیں۔'' پھر وہ تابانہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابانہ! یہ میری بیٹی ہیں الہام۔''

تابانہ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے پاپا کی بہت بڑی فین ہوں ڈیئر! آج اتنے برسوں بعد ان کو دیکھ رہی ہوں تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ واقعی دیکھ رہی ہوں۔ ہم یہاں ایک ہی بلاک میں رہتے رہے اور ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔''

الہام نے اپنے مخصوص معصومانہ انداز میں تابانہ کو سلام کیا پھر بولی۔ ''ویسے مجھے تھوڑا تھوڑا لگ رہا ہے کہ آپ کو آتے جاتے دو چار بار دیکھا ہے۔''

''الہام! وہی دائیں طرف کارنر والا گھر ہے ہمارا، جس کے گرین شیڈز ہیں۔ ویسے اب مجھے بھی لگ رہا ہے کہ یہ پیاری پیاری صورت میں اپنے آس پاس دیکھتی رہی ہوں۔'' اس نے الہام کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد عدیل ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھا رہا تھا اور تابانہ ساتھ والے کمرے میں الہام کے ساتھ بیٹھی تیز رفتاری سے باتیں کر رہی تھی۔ الہام بھی جلد ہی ..... اس کے ساتھ بے تکلف ہو گئی تھی۔ اب دونوں کی باتیں رکنے میں نہیں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

پولیس کا محکمہ کبھی بھی عدیل کو راس نہیں آیا تھا۔ وہ خود کو اپنے اردگرد کے لوگوں میں بالکل مس فٹ محسوس کرتا تھا۔ پولیس ٹریننگ کے دوران میں اس نے اپنے لیے باکسنگ کی اسپورٹس چنی تھی...... اس نے پنجاب کی سطح پر چند مقابلے بھی جیتے تھے۔ بعدازاں جب اس کا جی پولیس کی نوکری سے اچاٹ ہوا تو اس نے ایک بار پھر اپنے گیم پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ اسے یکا یک کامیابی ملی اور پھر ایک بڑے ایونٹ میں واپڈا کے ایک باکسر کو اَپ سیٹ شکست دے کر وہ ایک دم اوپر کے ناموں میں آ گیا۔ بعدازاں کچھ وجوہات کی بنا پر اسے محکمہ بالکل چھوڑنا پڑا اور اس نے خود کو ایک چیمپئن باکسر کے طور پر اسٹیبلش کر لیا۔ اس کی بیوی سنبل نے ہر ہر قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس کی کامیابیوں میں سنبل کا بڑا کردار تھا۔ سنبل کو کھونے کے بعد اس نے باکسنگ کو ہی نہیں کھویا تھا خود بھی کھو دیا تھا۔ اس حادثے کے وقت الہام فقط سات آٹھ سال کی تھی۔ عدیل نے اسے اپنے سینے سے چمٹا کر مزید زندہ رہنے کا جواز ڈھونڈ لیا تھا۔ الہام بہت حد تک سنبل کی تصویر تھی۔ وہ نہ ہوتی تو شاید شریک حیات کا غم اسے مار ہی ڈالتا۔

وہ دوپہر کے قیلولے کے بعد بستر پر لیٹا انہی خیالوں میں گم تھا جب اسے چھت پر دھما دھم کی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ عدیل نے ملازمہ راحت کو آوازیں دیں لیکن وہ شاید لان میں تھی۔ اس نے الہام کو پکارا۔ دوسری، تیسری آواز پر وہ سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اترتی دکھائی دی۔ اس نے ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے اور وہ ہانپی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے تابانہ بھی اترتی دکھائی دی۔ وہ جین اور جرسی میں تھی۔ وہ بھی کچھ ہانپی ہوئی تھی اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ دونوں نے عدیل کو سلام کیا اور اس کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔

''یہ کیا ہو رہا تھا اوپر؟'' عدیل نے پوچھا۔

الہام نے شوخی سے تابانہ کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ''پاپا! ان سے ملیے...... یہ ہیں میری ٹیچر مس تابانہ عاطف۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میری نئی ٹیچر...... میں آج سے

ان کی شاگرد ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"پاپا! یہی جو دھم دھم آپ نے سنی ہے اس سلسلے میں۔ یہ مجھے جوڈو سکھائیں گی بلکہ ان کی اتنی زیادہ "کامپیڈنس" ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ یہ مجھے گھر آکر سکھایا کریں گی۔ ہفتے میں تین روز۔" وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھی۔

عدیل ٹپٹا سا گیا لیکن اُس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پچھلے آٹھ دس روز میں تابانہ کی دخل درمعقولات میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ تقریباً ہر دوسرے روز چلی آتی تھی۔ دو بار وہ کچھ پکا کر بھی لائی تھی۔ پھر ایک دن وہ ڈھیر سارے پرانے ملکی اور غیر ملکی میگزینز لے آئی تھی۔ ان میں کسی نہ کسی طور عدیل کا تذکرہ تھا یا تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ اس دن اس کی والدہ بھی ساتھ آئی تھیں۔ وہ تقریباً پچپن برس کی ماڈرن لیکن مدبّری خاتون تھیں۔ کلب چلانے میں وہ تابانہ کی معاونت بھی کرتی تھیں۔ وہ بڑے اشتیاق سے ملیں۔ دونوں نے عدیل کے ساتھ تصویریں وغیرہ بنوائیں۔ تابانہ جو پرانے رسالے اٹھالائی تھی، یہ کام عدیل کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ عدیل اس ماضی کو زیادہ یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس تابناک ماضی کے ساتھ سنبل کی بے شمار یادیں بھی یلغار کر کے ذہن میں آگھستی تھیں۔

"کس سوچ میں کھو گئے پاپا۔" الہام کی آواز نے عدیل کو اس کے خیال سے چونکایا۔ وہ عدیل کے کندھے پر ٹھوڑی رکھ کر شوخی سے بولی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ مس تابانہ مجھ سے کوئی فیس چارج نہیں کریں گی۔ کیوں مس، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اس نے گردن گھما کر تابانہ کی طرف دیکھا جو کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"بالکل الہام۔ فیس کا کوئی سوال نہیں۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر مجھے بہت اچھا لگے گا...... ہاں...... اگر سر اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہیں تو یہ علیحدہ بات ہے۔" آخری جملہ اس نے عدیل کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا شوخی سے ادا کیا تھا۔

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟" عدیل نے سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ بدلے میں مجھے باکسنگ کے تھوڑے سے داؤ پیچ سکھا دیں تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

تابانہ نے گو یہ بات ہلکے پھلکے انداز میں کہی تھی مگر عدیل کو ناگوار گزری۔ عدیل کے تاثرات دیکھ کر وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی...... اور موضوع بدل دیا۔ الہام کی کوئی بھی بات ٹالنا عدیل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی ہر ادا میں اسے مرحومہ بیوی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہی سنبل کی سی شفاف مسکراہٹ، وہی اندازِ گفتگو...... وہی دوسروں کا درد بانٹنے کی خُو اور ہر وقت کام میں لگے رہنے کی دُھن۔

اس نے بڑی آسانی سے عدیل سے یہ اجازت لے لی تھی کہ وہ ہفتے میں تین بار آدھ پون گھنٹا تابانہ کے ساتھ گزار لیا کرے۔ اگلے آٹھ دس روز میں تابانہ کئی بار ان کے گھر آئی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ فزیوتھراپی بھی جانتی ہے۔ جوڈو کی پریکٹس کے لیے الہام نے ایک مہنگا گدا بھی منگوالیا تھا۔ اس گداز گدّے کے باوجود دھما دھم کی آوازیں بالائی منزل سے نیچے پہنچتی تھیں۔ تاہم ان آٹھ دس روز میں ایک بار بھی تابانہ سے عدیل کا سامنا نہیں ہوا۔ وہ جان بوجھ کر اسے Avoid کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اسے تابانہ سے گریز کرنا چاہیے۔ کسی وقت عدیل سے بات کرتے ہوئے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت نمودار ہوتی تھی۔ وہ اس کیفیت کو صرف پسندیدگی نہیں کہہ سکتا تھا لیکن پسندیدگی کے علاوہ کوئی نام بھی نہیں دے سکتا تھا پھر اسے اس دن والی بات کا بھی غصہ تھا۔ اس نے باکسنگ سیکھنے والی بیکار سی بات کر ڈالی تھی۔

ایک روز وہ ایسے وقت آدھمکی جب الہام اسکول گئی ہوئی تھی۔ عدیل کمرے میں تھا اور فون پر جمیل سے بات کر رہا تھا۔ جمیل اس کا چھوٹا بھائی ہی نہیں غم خوار دوست بھی تھا۔ بیوی بچوں والا ہونے کے باوجود عدیل سے اس کا تعلق ایسے ہی تھا جیسے دونوں ابھی تک لڑکے بالے ہوں۔ خاص طور سے والدین کی وفات کے بعد وہ عدیل سے اور بھی قریب ہوگیا تھا پھر جب عدیل کو حادثہ پیش آیا تو جمیل نے اس کی صحت کی بحالی اور اس کا غم بانٹنے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اس حادثے سے پہلے ہی دونوں بھائیوں نے پراپرٹی کی "سیل پرچیز" کا چھوٹا سا کام شروع کر دیا تھا۔ حادثے کے بعد اس کام کی تمام تر ذمے داری جمیل نے خود اٹھالی تھی۔ اب یہ کام کافی پھل پھول چکا تھا۔ جمیل کسی خاص موقع پر ہی عدیل کو زحمت دیتا تھا ورنہ وہ کاروبار کے سارے مسائل خود ہی ہینڈل کرتا تھا۔

دونوں بھائیوں میں گفتگو کے دوران میں ہی کمرے کے بند دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ "کون؟" عدیل نے پوچھا۔

"میں تابانہ ہوں جی۔ اندر آسکتی ہوں۔" ایک لمحے کے لیے عدیل ٹپٹایا پھر اس نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ "یار سوری، ایک ملنے والا آگیا ہے۔ شام کو بات کریں گے۔" فون بند کرکے وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "آجاؤ۔"

وہ دروازہ دھکیل کر اندر آگئی۔ اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا بھی آیا۔ آج وہ شلوار قمیص میں دکھائی دے رہی تھی۔ کندھوں پر شال تھی۔ وہ ذرا جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ اس روز مایوسی میں نے منہ سے وہ بات نکال دی۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ انجری کے بعد آپ باکسنگ وغیرہ سے بالکل دور ہوچکے ہیں اور ایک مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔"

عدیل نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ ذرا آگے جھک کر ملتجی لہجے میں بولی۔ "آئی ایم سوری، میں آئندہ احتیاط کروں گی۔"

عدیل نے بستر پر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو کوئی بات نہیں، اگر تمہیں احساس ہوگیا ہے تو اچھی بات ہے۔"

"اگر آپ کہیں تو آپ کے لیے چائے بنا دوں۔"

عدیل نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی اثنا میں تابانہ کی نگاہ عدیل کے پاؤں پر پڑی۔ پاؤں ٹھیک ہو چکا تھا تاہم دو انگلیوں پر ابھی تک زخم موجود تھا۔ وہاں سے بینڈیج کھسکی ہوئی تھی۔ "اوہو، آپ کی بینڈیج ٹھیک ہونے والی ہے۔" اس نے کہا۔

"میں کرلیتا ہوں اسے۔" عدیل نے بستر پر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ پاؤں کی طرف جھکا تو ہمیشہ کی طرح تیزی سے جھکا نہیں گیا۔ اس کی کیفیت محسوس کرکے وہ فوراً بولی۔ "ٹھہریے میں کردیتی ہوں۔"

عدیل کے روکتے روکتے وہ بستر پر پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور عدیل کا پاؤں پہلے کی طرح بڑی احتیاط سے گود میں رکھ لیا۔ جیسے وہ پاؤں نہ ہو، کوئی چھوٹا سا بچہ ہو جسے وہ اپنی آغوش کی نرمی و گرمی دے رہی ہو۔ پاس والی تپائی سے اس نے کاٹن اور پائیوڈین اٹھائی۔ محلول سے عدیل کی انگلیاں صاف کرکے اس نے نئی بینڈیج لگا دی۔ وہ اپنے گداز ہاتھوں کو بڑی نرمی سے عدیل کے پاؤں پر گردش دے رہی تھی۔ بینڈیج مکمل ہوتے ہی عدیل نے اپنا پاؤں اس کی گود سے کھینچ لیا۔

واش بیسن پر ہاتھ دھوکر وہ پھر کرسی پر آن بیٹھی۔ اس نے اپنی سرخ جرسی کی ایک پاکٹ میں سے ایک کارڈ سائز کی تصویر نکالی۔ یہ انہی تصویروں میں سے ایک تھی جو چند روز پہلے اس نے اپنے اسمارٹ فون سے لی تھیں۔ ان تصویروں میں عدیل کے علاوہ تابانہ کی والدہ بھی موجود تھیں لیکن جو تصویر تابانہ اب عدیل کو دکھا رہی تھی اس میں صرف عدیل اور تابانہ ہی نظر آتے تھے۔ شاید اس میں عدیل اور تابانہ ہی تھے یا تصویر پرنٹ کراتے ہوئے اس نے اپنی والدہ کو فریم میں سے نکال دیا تھا۔

تصویر دیکھ کر عدیل کو سینے میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ تصویر کا انداز ایسا تھا جیسے یہ ایک "کپل" کی تصویر ہو۔ وہ بڑی شان سے سینہ تانے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے عدیل کے پہلو میں کھڑی تھی۔ "کتنی صاف اور پیاری تصویر آئی ہے سر۔" وہ عدیل کی جانب دیکھ کر بولی۔

"اچھی ہے۔" عدیل نے کہا اور ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر تصویر سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ سرخ جرسی کے کالر سے ٹنگا ہوا قلم اتار کر بولی۔ "پلیز، اس کے پیچھے سائن کر دیجیے۔ میرے لیے یادگار رہے گا۔"

عدیل نے بے دلی سے سائن کردیے پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "تم سے ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں۔"

"دیکھیں، اب آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں، آپ کو کسی بھی سلسلے میں مجھ سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تم نے ابھی تک شادی نہیں کی، کوئی خاص وجہ ہے؟"

وہ مسکرائی اور دانت لشکارے مارنے لگے۔ "ویسے میری عمر ابھی اتنی بھی زیادہ نہیں ہوئی سر! اٹھائیس سے زیادہ اور انتیس سے کم ہوں۔" اس نے ہنس کر اپنے تراشیدہ بالوں کو ہلکورا دیا اور بولی۔ "ایک جگہ منگنی ہوئی تھی جی۔ لڑکا بے وقوفی کی حد تک کھلنڈرا اور رنگیلا تھا۔ میرا جی اچاٹ ہوگیا پھر ایک جگہ اور بات چلی۔ اس کاٹھ کے الّو کی کوئی اپنی رائے ہی نہیں تھی۔ ایک دن کہتا تھا کہ اسے میرے کلب چلانے پر کوئی اعتراض نہیں، دوسرے دن انکاری ہو جاتا تھا۔ دراصل وہ اپنے ماما، پاپا کا ریموٹ کنٹرول کھلونا تھا۔ اب سچ پوچھتے ہیں تو مجھے ان لاابالی قسم کے لاابالی "نونہالوں" سے الرجی سی ہوگئی ہے۔ مجھے سمجھ لی، سنجیدہ طبیعت کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ ان کی سوچ میں پختگی ہوتی ہے۔ نونہالوں والی سطحی جذباتیت بھی نہیں ہوتی ان میں......" وہ سر جھکا کر عام سے لہجے میں بولتی چلی جارہی تھی

مگر اُس کے لہجے کی تہ میں ایک معنی خیزی بھی تھی۔ عدیل بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

☆☆☆

عدیل کو پاکستان اور پاکستان کے باہر سے بھی ڈھیروں خطوط اور پیغامات آتے تھے۔ لوگ اسے ایک ہردلعزیز باکسر کے طور پر جانتے تھے (بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ کسی وقت ہاکی کا کھلاڑی بھی رہا ہے) باکسنگ میں عدیل کی پہچان تھی کہ وہ Ring میں ہمیشہ بہت پُرسکون نظر آیا کرتا تھا۔ اپنے حریفوں پر گرجتا برستا نہیں تھا۔ بڑے اطمینان سے بلکہ مسکراتے انداز میں اپنا دفاع کرتا تھا۔ اس کی جارحیت میں بھی ایک طرح کی فن کاری ہوتی تھی۔ لوگ اس کے انداز کو بہت پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی مجبوری کا احساس کیے بغیر لوگ ایک بار پھر اس کو Ring میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ اسپانسرز نے تو اسے بڑی بڑی آفرز کے ذریعے مجبور بھی کیا تھا کہ وہ پھر Ring میں آئے۔ ایسا ہی ایک شخص ظہور باوا نامی بھی تھا جو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

وہ کچھ خطوط دیکھ رہا تھا۔ جمیل اور اس کی بیوی آمنہ بھی آئے ہوئے تھے۔ جمیل نے کہا۔ ''بھائی جان! پرسوں ایک اسپورٹس چینل پر آپ کا ایک پرانا انٹرویو چلایا جا رہا تھا۔ لوگ آپ کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں، کیونکہ......'' جمیل کی بات ادھوری رہ گئی، پرانا ملازم شرفو بابا اور الہام بھاگتے ہوئے اندر آئے۔ الہام نے کہا۔ ''پاپا! جلدی باہر آئیں۔ سامنے سڑک پر کچھ لوگ ٹیچر سے جھگڑا کر رہے ہیں......''

عدیل اور جمیل کمرے سے نکلے اور لان کراس کر کے گیٹ سے باہر آئے۔ سہ پہر کی چمکیلی دھوپ میں کچھ فاصلے پر سڑک کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ الہام کی ٹیچر یعنی تابانہ کی آلٹو گاڑی ایک کنارے پر کھڑی تھی۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پینٹ جیکٹ میں ملبوس تابانہ سڑک پر تھی۔ دو ہٹے کٹے لڑکے اور ایک فیشن ایبل لڑکی تابانہ سے جھگڑ رہے تھے۔ نوبت گالی گلوچ تک پہنچ چکی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ گتھم گتھا ہو گئے۔ تابانہ بھی کوئی عام نہیں تھی۔ جوڈو کی کھلاڑی رہی تھی اور باقاعدہ کلب چلاتی تھی۔ اس نے ایک موچھیل لڑکے کو گھما کر دیوار سے دے مارا۔ مقابل لڑکے کے بال تابانہ کی گرفت میں آ گئے۔ اس نے بال کھینچ کر اسے رکوع کے بل جھکایا اور پھر ٹانگ مار کر دور پھینک دیا مگر اس دوران میں دوسرے لڑکے نے اسے عقب سے بازوؤں کے شکنجے میں لے لیا۔ پہلے والا لڑکا بھی سنبھل کر اس سے چمٹ گیا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی اندرونی سڑک پر ہونے والا یہ دنگل اِکا دُکا راہ گیر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

عدیل اور جمیل تیزی سے آگے بڑھے۔ موچھیل لڑکا طیش کے عالم میں تابانہ کو زمین بوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمیل نے آگے بڑھ کر اسے چھاپ لیا۔ دوسرے لڑکے کو عدیل کا ایک زوردار گھونسا سہنا پڑا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔ تابانہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ عدیل چاہتا تو حملہ آور لڑکے کو ایک دو گھونسے مزید رسید کر کے لمبا لٹا سکتا تھا مگر اپنی مضروب کمر کی وجہ سے وہ ایسی مہم جوئی سے ہمیشہ دامن بچا لیتا تھا...... تابانہ اور جمیل نے اس لڑکے کو بھی چند کراری ضربیں لگائیں۔ اب اردگرد کے کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ دونوں حملہ آور لڑکے، فیشن ایبل لڑکی سمیت دھمکیاں دیتے اور گالیاں بکتے اپنی ہنڈا گاڑی میں بیٹھے اور موقع سے کھسک گئے۔

تابانہ کا چمکیلا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کی جیکٹ ایک طرف سے پھٹ گئی تھی لیکن ویسے اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ پتا چلا کہ وہ عید کی کچھ شاپنگ کرنے کے لیے گھر سے نکلی تھی کہ ان لوگوں نے اس کا رستہ روکا اور جھگڑا شروع کر دیا۔ یہ ایک طرح سے کاروباری رقابت کا معاملہ تھا۔ تابانہ گلبرگ کے علاقے میں لڑکیوں کے لیے جوڈو کا کلب چلا رہی تھی، یہ لوگ بھی وہیں پر مارشل آرٹ اور یوگا وغیرہ کا کلب چلاتے تھے۔ دونوں میں کئی ماہ سے کشمکش چل رہی تھی جو اب سیدھا سیدھا جھگڑے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

عدیل نے تابانہ سے پوچھا۔ ''تمہاری والدہ کہاں ہیں؟'

وہ اپنی سانسیں درست کر چکی تھی۔ اپنے ڈیانا کٹ بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ ''عید کی چھٹیوں کی وجہ سے کلب بند ہے۔ وہ پنڈی میں اپنی بہن کے ساتھ عید گزارنا چاہتی تھیں اس لیے وہاں گئی ہوئی ہیں۔''

''اوہ۔'' جمیل نے ہونٹ سکیڑے۔ ''کہیں یہ لوگ آپ کو دوبارہ پریشان تو نہیں کریں گے؟''

''کریں گے تو نمٹ لوں گی اُن سے۔''

''ہمارا مطلب ہے، کوئی مرد وغیرہ ہے گھر میں؟'' عدیل نے پوچھا۔

''ہے تو نہیں سر! لیکن میں کلب سے گارڈ کو بلوا لوں

گی۔"

وہ چاندرات تھی۔ جمیل اور آمنہ اپنے گھر واقع گلشن راوی واپس جاچکے تھے۔ عدیل اپنے سخت بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ کمر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ عدیل کی نگاہیں سامنے دیوار پر سنبل کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ خوشی کے ایسے موقعوں پر ماضی کے ماہ و سال ایک فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے متحرک ہوجاتے تھے۔ وہ ایک مثالی بیوی تھی۔ عدیل کی والدہ قدسیہ بیگم ہی نہیں گھر کا ہر فرد اس پر جان چھڑکتا تھا، کوئی بھی اسے نہیں بھول سکا تھا...... تو وہ کیسے بھولتا۔ وہ تو آٹھ برس تک اس کی دلنشیں خلوتوں اور بیش بہا محبتوں کا ساتھی رہا تھا۔

الہام تیزی سے اندر آئی اور عدیل کو اس کے خیالوں سے چونکا دیا۔ "پاپا! میں نے ابھی مس تابانہ کو فون کیا ہے۔ وہ گھر میں اکیلی ہیں اور تھوڑا پریشان بھی ہیں جھگڑے کی وجہ سے۔"

"اکیلی کیوں ہیں، وہ تو کہتی تھیں کہ کلب سے گارڈ کو بلالیں گی؟"

"ان کا گارڈ بھی ہر صورت اپنے گاؤں جانا چاہتا ہے...... ویسے پاپا...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم مس تابانہ کو دو تین دنوں کے لیے یہاں لے آئیں؟"

"کیا انہوں نے اس بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں، کہا تو نہیں۔ لیکن ان کی باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید وہ چاہتی ہیں۔ اِن فیکٹ یہاں لاہور میں ان کا کوئی رشتے دار بھی تو نہیں ہے۔"

الہام مُصر ہوگئی کہ وہ اپنی ٹیچر تابانہ کو دو تین دن کے لیے یہاں لے آتی ہے۔ عدیل کے لیے الہام کی بات کو ٹالنا ہمیشہ سے بہت دشوار تھا۔ اگر وہ ٹالتا تو وہ عید کے یہ دو تین دن خوش ہوکر نہ گزار سکتی۔ ویسے بھی موجودہ صورتِ حال میں تابانہ کا گھر میں اکیلے رہنا کچھ غیر محفوظ لگتا تھا۔ عدیل نے اجازت دی تو الہام ملازمہ راحت کے ساتھ جاکر تابانہ کو اس کے مختصر سامان سمیت لے آئی۔

وہ تینوں رات کو دیر تک بیٹھی رہیں۔ ایک دوسرے کو مہندی وغیرہ لگاتی رہیں۔ عید کا دن بھی اچھا گزرا۔ جمیل، آمنہ اور ان کے بچے بھی آگئے۔ کل کے ناخوشگوار واقعے کو بھول کر تابانہ بھی چہک رہی تھی۔ اس نے آج چمکیلا مشرقی لباس زیب تن کررکھا تھا۔ تراشیدہ بالوں کے باوجود یہ لباس اسے جچ رہا تھا۔ جتنی بار اس کی نگاہ سے عدیل کی نگاہ ملی، اسے ایک سنسنی سی محسوس ہوئی۔ وہ سنسنی جسے وہ ہرگز محسوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دن تو ٹھیک گزرا لیکن شام کے بعد عدیل کو ہلکا سا بخار ہوگیا۔ چھینکیں وغیرہ بھی آئیں۔ اسے فلو کی شکایت ہوگئی تھی۔ پیناڈول وغیرہ کھا کر وہ جلدی سو گیا۔ رات کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو گہری غنودگی میں اسے اپنے ماتھے پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ کمرے کی ہلکی روشنی میں تابانہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔

وہ تکیے کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا اور ذرا تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "آپ بخار کی حالت میں بڑبڑا رہے تھے۔ میں آواز سن کر آگئی۔ آپ کہہ رہے تھے...... سر درد سے پھٹا جارہا ہے...... پلیز ذرا دبا دو۔" پھر وہ ذرا جھجک کر اور رک کر بولی۔ "آپ...... اپنی مسز کا نام لے رہے تھے۔ سنبل تھا نا اُن کا نام؟"

عدیل نے تکیے سے ٹیک لگائی تاہم تابانہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رات کے دو بجے اس کے بستر پر چڑھی بیٹھی تھی۔ عدیل کو یہ سب عجیب محسوس ہورہا تھا۔ الہام یا راحت میں سے کوئی دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا۔

وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "آپ کا جسم اب بھی تپ رہا ہے۔ کوئی دوا وغیرہ لے لیں۔"

وہ بھاری آواز میں بولا۔ "یہ عام سا فلو ہے۔ میں فلو میں دوا وغیرہ نہیں لیا کرتا۔ شام کو بھی الہام نے زبردستی پیناڈول کھلا دی تھی...... بس وہ پانی والا گلاس یہاں تپائی پر رکھ دو اور جاؤ...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے شاپی سے گلاس میں تازہ پانی بھر کر عدیل کے سرہانے رکھا۔ اس کے کمبل کو ڈبل کیا اور پھر اجازت لے کر چلی گئی۔ عدیل نے جماہی لی اور ناپسندیدگی کے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ مگر ایک ہی منٹ بعد وہ پھر کمرے کے دروازے پر نمودار ہوگئی۔ کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر بولی۔ "سوری سر! آپ کو پھر ڈسٹرب کرنے آگئی۔ پلیز بُرا نہ مانیے گا۔" اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا۔ آپ کے لیے عید کارڈ ہے۔ کل وہ جھگڑے والا واقعہ ہوگیا۔ آپ کو دے نہ سکی لیکن خیر اب بھی کون سا عید گزر گئی ہے۔ ہمارے ہاں عید کارڈ لینے اور دینے کی خوب صورت روایت کو یہ موبائل فونز کھا گئے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ یہ روایت زندہ رہے۔" اس نے جھک کر لفافہ عدیل کے سرہانے رکھ دیا۔

وہ سلک کے ڈھیلے ڈھالے نائٹ گون میں تھی پھر بھی جسم کئی جگہوں سے نمایاں ہو رہا تھا۔

عدیل نے اپنے اندر کی ناگواری کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ۔ بہرحال اس کی ضرورت نہیں تھی۔ باقی تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔ پتا نہیں کتنی دیر یہاں بیٹھ کر میرا سر دباتی رہی ہو، مجھے فلو ہو رہا ہے۔ یہ بڑی جلدی ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔“

وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔ ”آپ کا فلو مجھے ٹرانسفر ہو جائے تو یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

عدیل کی سٹپٹاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے لفافہ چاک کر کے عید کارڈ دیکھا۔ ایک سہانی شام میں دیو دار کے ایک بلند و بالا درخت کے تنے کے سامنے ایک لڑکی دوزانو بیٹھی تھی اور زمین بوس شاخوں کو دیکھ رہی تھی۔ نیچے انگلش کے دو رومانی VERSES بھی پرنٹ تھے۔

عدیل نے ٹھنڈی سانس لے کر کارڈ ایک طرف رکھ دیا وہ کوئی انجان لڑکا نہیں، ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ تابانہ جس رخ پر جا رہی تھی، وہ اچھی طرح عدیل کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ ایک سیلابی ریلے کی طرح بڑھتی چلی آ رہی تھی اور اس امر سے بے خبر تھی کہ یہ سب کچھ عدیل کو پسند نہیں آ رہا۔ سنبل کے بعد زندگی کا یہ باب اس کے لیے تقریباً بند ہو گیا تھا۔ پھر وہ ایک جوان ہوتی بیٹی کا باپ تھا، وہ اس قسم کی خرافات میں پڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے باکسنگ کے رنگز سے آؤٹ ہوئے سات برس ہونے کو آئے تھے مگر اب بھی ملک میں اور ملک سے باہر اس کے اَن گنت فین موجود تھے۔ ان میں ہر عمر کے مرد و زن شامل تھے۔ دو چار ایسی پُرجوش نی میل پرستار بھی تھیں جنھوں نے اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی مگر عدیل نے ہمیشہ اپنے اور اپنے چاہنے والوں کے درمیان ایک معقول فاصلہ رکھا تھا۔ یہاں ستم یہ ہوا تھا کہ یہ جوشیلی پرستار نہ صرف اس تک پہنچ چکی تھی بلکہ اس کے گھر میں بھی موجود تھی۔ وہ صرف پرستار ہوتی تو بھی کوئی بات نہیں تھی مگر اس کا ”تعلق“ تو ایک نہایت سنجیدہ قسم کا رومانی ٹچ لیے ہوئے تھا۔ اب یہ صورتِ حال عدیل کو کچھ کچھ ہراساں کرنے لگی تھی۔ وہ جس ہیجانی انداز میں اس کے اردگرد موجود تھی، عدیل کا دفاع کمزور نہ بھی ہوتا تو لرزہ براندام ضرور ہو سکتا تھا۔ پھر پچھلے دو تین ہفتوں میں عدیل نے ایک اور بات محسوس کی تھی اور یہ بڑی ”شاکنگ“ تھی۔ اُسے یوں لگا تھا کہ وہ عدیل اور اس کی بیٹی کے درمیان ایک پردہ سا تان رہی ہے۔ الہام اب عدیل پر پہلے جیسی توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کا جو وقت اسٹڈی سے بچتا تھا، وہ اپنی اس نئی ٹیچر کے اردگرد گزر جاتا تھا۔ کبھی اسے فون کر رہی ہوتی تھی۔ کبھی اس کے ساتھ ٹریننگ میں اور کبھی ٹریننگ کی دہرائی وغیرہ میں مصروف ہوتی تھی۔ اب ٹیچر صاحبہ دو روز سے ویسے ہی گھر میں موجود تھیں۔ الہام نے تقریباً ساری عید اس کی معیت میں ہی گزار دی تھی۔ کسی وقت تو عدیل کو یوں بھی محسوس ہوا تھا جیسے وہ باپ بیٹی کے غیر معمولی پیار سے تھوڑا بہت حسد بھی کرتی ہے۔

اگلے روز ٹرو تھا۔ دوپہر سے ذرا پہلے الہام دندناتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ ”پاپا! آج ٹرو ہے۔ کہیں آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔ چچا جمیل کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... لیکن میری طبیعت رات سے کچھ خراب ہے۔“

”او مائی گاڈ، کیا ہوا؟“ اس نے جلدی سے عدیل کا ماتھا چھوا۔

”نہیں کچھ زیادہ نہیں ہلکا زکام اور بخار ہے۔“ اس نے الہام کو تسلی دی۔

وہ فکرمند نظر آنے لگی۔ ”کوئی دوا لی آپ نے پاپا؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ الماری سے تھرمامیٹر نکال لائی اور بخار چیک کرنے لگی۔

اسی اثنا میں تابانہ بھی ناک سے سُوں سُوں کرتی اندر آ گئی۔ اس کی ستواں ناک سرخ ہو رہی تھی اور ہاتھ میں ٹشو پیپر تھا۔

الہام بولی۔ ”او مس! آپ کو بھی فلو ہو گیا؟“

”ہاں تھوڑی سی شکایت ہو ہی گئی ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”مس! کوئی دوا لی آپ نے؟“

”نہیں...... دوا لوں گی تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب؟ آپ نہیں چاہتیں کہ یہ ٹھیک ہو؟“

اُس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں...... بڑی دیر بعد ہوا ہے فلو۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ کبھی کبھار یہ ہو جانا چاہیے۔“

عدیل تھرمامیٹر منہ میں دبائے خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ الہام اب عدیل کا سر دبانے لگی تھی۔ تابانہ نے فوراً اسے ٹوکا۔ ”نہیں الہام! تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ کہیں بیمار نہ ہو جانا۔ مجھے تو ہو چکا ہے اس لیے میں دیکھتی ہوں ان کو۔“

الہام چاروناچار اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے کے

پاس پہنچ کر بولی۔ ''پاپا! آپ کے لیے جوشاندہ بنا کر لاؤں؟''

اس سے پہلے کہ عدیل جواب میں کچھ کہتا، تابانہ فوراً بولی۔ ''بھئی الہام! کہا ہے نا تم سے۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں بنادوں گی جوشاندہ بھی۔''

الہام چلی گئی۔ تابانہ تھرما میٹر دیکھنے کے بعد عدیل کا ہاتھ چھو کر بولی۔ ''بس ہلکی سی حرارت ہے۔ انشاء اللہ کل تک اچھے ہو جائیں گے۔ ویسے رات تو ٹھیک گزری نا آپ کی؟''

عدیل کو غصہ آرہا تھا، لیکن اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

وہ دو دن گھر میں مزید رہی۔ اگلے روز عدیل کی طبیعت بہتر ہوگئی تھی، بخار بھی اتر گیا تھا مگر وہ مسلسل اس کے اردگرد منڈلاتی رہی تھی۔ کسی وقت تو وہ عدیل کو کچھ کھسکی ہوئی لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سے ہر وقت کچھ شعاعیں سی نکلتی رہتی تھیں اور یہ شعاعیں گاہے گاہے عدیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھیں۔

جھگڑے والا واقعہ اب کچھ ٹھنڈا ہی نظر آرہا تھا۔ مخالف پارٹی کی طرف سے کسی طرح کی کوئی کارروائی سامنے نہیں آئی تھی جس روز تابانہ کی والدہ میڈم تنویر پنڈی سے واپس آئیں اسی روز وہ بھی گھر چلی گئی...... لیکن جاتے جاتے وہ ایک کارنامہ بھی انجام دے گئی۔

رات کو عدیل نے اپنا سلیپنگ گاؤن پہنا تو اس کی جیب میں اسے کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ گلابی لیٹر پیڈ پر ایک تہ شدہ خط تھا جو تابانہ کی طرف سے تھا۔ تحریر کچھ اس طرح تھی۔

جناب! شاید آپ میرے جذبات کو میرا لاابالی پن سمجھتے ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ کوئی حالیہ ایک دو ماہ کا قصہ نہیں ہے، یہ کئی برسوں پر محیط کتھا ہے۔ ڈیڈی چلے گئے لیکن شاید وہ آپ کے لیے اپنی ساری پسندیدگی مجھ میں منتقل کر گئے۔ جب پچھلے ماہ آپ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو یوں لگا جیسے ایک برسوں پرانے سپنے کو تعبیر مل گئی ہے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آیا تھا اور نہ اب آرہا ہے۔ پتا نہیں کہ میرے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں آپ کی صرف پرستار نہیں ہوں...... میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ سے ملنے کے بعد اس محبت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ اگر میں نے اب آپ کو کھو دیا تو شاید یہ زندگی...... زندگی ہی نہ رہے۔ یہ سب کچھ میرے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے اگر آپ مجھے اس سے روکنے کی کوشش کریں گے تو یہ بے سود ہوگی۔ آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گی...... چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لیے...... یہ مناسب نہیں آدمی کے لیے...... آپ کی...... اور صرف آپ کی......

خط پڑھ کر عدیل کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس عورت یا اس لڑکی کی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اپنی اور عدیل کی عمروں کے فرق کا لحاظ کیے بغیر اور دیگر حالات کو دیکھے بغیر وہ اندھادھند یک طرفہ ٹریفک چلانے کی کوشش کررہی تھی۔ عدیل نے خط پھاڑ کر اس کے پرزے کیے اور پھر انہیں ایک چھوٹے شاپر میں لپیٹ کر باہر کوڑے دان میں پھینک دیا۔ تابانہ نے آخر میں جو شعر لکھا تھا وہ یقیناً عدیل کی موجودہ زندگی اور سنبل کی جدائی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

اگلے روز بھی تابانہ کا وہ خط اور اس کے مندرجات عدیل کی نگاہوں میں گھومتے رہے۔ اس کی اندھادھند پیش قدمی نے عدیل کو جھنجوڑ سا ڈالا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ سوچیں چکما دے کر بار، بار اس کے ذہن میں گھس رہی تھیں۔ خود کو مصروف کرنے کے لیے وہ اپنے ''ہوم جم'' میں چلا گیا۔ خود کو فٹ اور اپنی کمر کو بحال رکھنے کے لیے وہ فزیو کی ہدایات کے مطابق ہلکی پھلکی ورزش کرتا رہتا تھا۔ کمر یعنی ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ وہ چلتے ہوئے بائیں رخ پر تھوڑا سا جھکا رہتا تھا۔ اگر ایک دو دن کے لیے ورزش چھوڑ دیتا تھا تو یہ جھکاؤ مزید بڑھ جاتا تھا۔

اسے لائٹ ایکسر سائز کرتے ہوئے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ جمیل حسب معمول ہلا گلا کرتے ہوئے اندر آگیا۔ بھتیجی الہام سے گپ شپ کرنے کے بعد وہ عدیل کے پاس پہنچا تو اس کی شوخی قدرے ماند نظر آئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''بھائی جان! وہ لڑکی چلی گئی......''

اس کا اشارہ تابانہ کی طرف تھا۔ عدیل نے اثبات میں جواب دیا۔

جمیل نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''بھائی! اس کی طرف سے آپ لوگوں کو شاید بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کے معاملے میں اور اس کی والدہ کے بارے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عدیل نے تولیے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

جمیل نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک لوکل

اخبار کا مڑا تڑا صفحہ نکالا۔ یہ تین روز پہلے کا اخبار تھا۔ اندرونی صفحے پر ایک دو کالمی خبر تابانہ اور اس کے ہیلتھ کلب کے بارے میں تھی۔ جمیل بولا۔ ''بھائی کل اتفاقاً اس خبر پر نظر پڑ گئی۔ آپ بھی دیکھیں۔''

عدیل نے خبر پڑھی اور اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس خبر میں تابانہ کے نیو ایج کلب کی کچھ مشتبہ سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ایک مخالف کلب کے اونر نے بیان دیا تھا کہ مارشل آرٹ کی آڑ میں نیو ایج کلب کے اندر غلط کاری ہورہی ہے۔ لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر امیرزادوں سے ان کی دوستیاں کروائی جاتی ہیں اور پھر مال بنایا جاتا ہے۔ مزید تفصیل بھی موجود تھی، اس کے علاوہ ایک متاثرہ لڑکی کا حلفیہ بیان بھی موجود تھا۔

عدیل نے خبر پڑھنے کے بعد کہا۔ ''جمیل! یہ سب کچھ اس جھگڑے کا شاخسانہ بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''بھائی! آگ ہوتی ہے تو دھواں نکلتا ہے نا۔ یہ لڑکی ویسے بھی ضرورت سے زیادہ تیز طرار لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھیں نا تو ایک علیحدہ سی چمک پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔''

جمیل کو ابھی ان کارستانیوں کا پتا نہیں تھا جو وہ یہاں کررہی تھی ورنہ اس کے بارے میں جمیل کی رائے اور بھی سخت ہوجاتی۔ عدیل کو ویسے بھی یہ ''پرستاری'' کچھ زیادہ بھائی نہیں تھی۔ اس کا تجزیہ یہی تھا کہ کسی کا فین ہونا بس ایک جذباتی عمل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جیسے چاند ستارے دور ہی سے اچھے لگتے ہیں۔ ایسے ہی اسٹارز اور سپر اسٹارز بھی بس ایک فاصلے سے ہی دلکش محسوس ہوتے ہیں۔ جب اُن کے دیوانے دو چار بار ان سے مل لیتے ہیں تو پھر ساری کشش و رومانیت ختم ہوجاتی ہے۔

اُس روز عدیل نے فیصلہ کرلیا کہ تابانہ اب مزید اس گھر میں نظر نہیں آئے گی اس نے سوچ لیا کہ صبح اس بارے میں الہام سے بات کرے گا اور اسے تابانہ کے ساتھ ملنے جلنے سے سختی کے ساتھ روک دے گا لیکن اس سے پہلے ہی ایک اور واقعہ ہوگیا جو زیادہ سنگین تھا۔

رات کو نو بجے کے بعد تین چار بار عدیل کے فون پر تابانہ کی کال آئی۔ عدیل نے فون سائلنٹ پر کردیا اور کال ریسیو نہیں کی۔ اس کی آخری کال رات بارہ بجے کے لگ بھگ آئی، جس کے بعد عدیل نے جھلا کر فون ویسے ہی بند کردیا اور سوگیا۔

وہ صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا۔ یہ عادت کالج کے زمانے میں ہاکی کے کھیل سے شروع ہوئی تھی، پولیس کی ٹریننگ اکیڈمی میں یہ عادت مزید پختہ ہوئی اور پھر باکسنگ کے کھیل نے اسے کچھ اور راسخ کردیا۔ آج کل بھی وہ صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب جاگ جاتا تھا اور ضروریات سے فارغ ہوکر کوٹھی کے لان میں چہل قدمی کرتا تھا۔ آج بھی اس کی یہی مصروفیت تھی۔ باقی گھر میں سناٹا تھا، شرفو بابا سمیت سب سورہے تھے۔ ڈوربیل نے اسے حیران کیا، صبح سویرے یہ کون آٹپکا تھا۔ کون؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ہوں سر۔'' تابانہ کی آواز نے اس کے بدن میں آتشیں لہر دوڑا دی۔

خود پر بہت ضبط کرتے ہوئے اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ اَن لاک کیا۔ باہر کے ملگجے میں وہ ٹراؤزر پر بھاری نارنجی جیکٹ پہنے کھڑی تھی۔ جیکٹ کے نیچے سفید رنگ کا ہائی نیک سویٹر تھا۔ ''اوہ تھینکس گاڈ۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''آپ ٹھیک ہیں نا جی؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔'' اس نے خشک، سوالیہ لہجے میں جواب دیا۔

''بتاتی ہوں، بتاتی ہوں، اندر تو آنے دیجیے۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

عدیل کو شک گزرا کہ کہیں یہ وہی جھگڑے والا معاملہ نہ ہو۔ اس نے اسے اندر آنے دیا۔ وہ اس کے ساتھ چلتی کامن روم میں آگئی۔ کچھ ہانپی ہوئی لگ رہی تھی۔ عدیل کڑی سوالیہ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''رات میں نے آپ کو اتنے فون کیے لیکن آپ نے جواب ہی نہیں دیا۔ میرے دماغ میں پتا نہیں کیا، کیا وسوسے آنے لگے۔ پھر میں نے الہام کو کال کی کہ آپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھ سکوں۔ لیکن وہاں بھی بیل جاتی رہی۔ وہ شاید سو رہی تھی۔ میں رات بھر پریشان ہی رہی۔ آپ نے بتایا تھا نا کہ زیادہ سردی میں آپ کی کمر کی تکلیف اچانک بڑھ جاتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک ایمبولینس یہاں سے گزری تو میری جان ہی نکل گئی۔ سیدھی آپ کی طرف آئی...... یہ دیکھیے...... میرا دل کتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔'' اس نے بے تکلفی سے عدیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھنے کی کوشش کی۔

جو ردِعمل ہوا وہ شاید اس کے وہم گمان میں نہیں تھا۔ ایک زنانے کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا گئی اور سراسیمہ نگاہوں سے عدیل کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک ہی لمحے میں اس کا چہرہ بالکل سفید ہوگیا تھا۔

عدیل دانت پیس کر بولا۔ ''کوئی شرم وحیا تمہارے اندر ہے یا نہیں۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ تمہاری یہ حرکتیں ہم سب کے لیے کتنی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی ہیں۔ گیٹ لاسٹ...... آئی سے گیٹ لاسٹ۔ میں دوبارہ یہاں تمہاری شکل نہ دیکھوں۔ اور خبردار جو تم کہیں الہام کے آس پاس بھی نظر آئیں۔'' طیش کے سبب عدیل کی آواز کانپ رہی تھی اور اس نے انگلی دروازے کی طرف اٹھا رکھی تھی۔

عدیل کا خیال تھا کہ وہ جلدی سے باہر نکل جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سفید چہرے اور ساکت جسم کے ساتھ کھڑی رہی۔ یوں محسوس ہوا کہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

''میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔'' عدیل نے پھنکارتی آواز میں کہا اور ایک بار پھر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

زوردار تھپڑ کے سبب اس کے بال اچھل کر چہرے پر آگئے تھے۔ اس نے لرزاں ہاتھ سے انہیں پیچھے ہٹایا۔ چند ساعتوں کے لیے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یوں لگا کہ وہ کوئی جوابی فقرہ بولنا چاہ رہی ہے مگر پھر اس نے اپنی بھیگی نگاہیں پھیر لیں۔ تیزی سے مڑی اور باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

دو روز بعد کی بات ہے، الہام تیز قدموں سے عدیل کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''پاپا! کچھ پتا چلا آپ کو مس تابانہ اسپتال میں ہیں۔''

''کیا ہوا؟'' عدیل نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''کہتے ہیں کہ انہیں بے ہوشی کی حالت میں لے جایا گیا ہے۔ ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نہیں۔ میں نے راحت کو بھیجا ہے کہ وہ معلوم کر کے آئے۔''

نہ جانے کیوں عدیل کو محسوس ہونے لگا کہ یہ وہی پرسوں والے تھپڑ کا شاخسانہ ہے۔ اسی دوران میں ملازمہ راحت بھی آگئی۔ ''کیا پتا چلا آنٹی؟'' الہام نے بے حد بے قراری سے پوچھا۔

''ان کے گھر تو میں نہیں جا سکی ہوں۔ وہاں تالا لگا ہوا ہے بی بی۔ پڑوس والوں سے سن گن ملی ہے کہ اس نے کوئی زہریلی دوا کھالی ہے اور بے ہوش ہو گئی ہے۔ شاید گھر میں کوئی جھگڑا چل رہا تھا یا ہو سکتا ہے کہ باہر کا ہی کوئی معاملہ ہو۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ کچھ دن پہلے سڑک پر جو مارا ماری ہوئی تھی۔''

الہام روہانسی آواز میں بولی۔ ''پاپا! ہمیں اسپتال جانا چاہیے۔ اُن کا پتا کرنا چاہیے۔''

عدیل نے ایک گہری سانس لی۔ ''الہام! اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ میں تمہارے چچا کو فون کرتا ہوں۔ وہ کوئی خیر خبر لیتے ہیں۔''

الہام کو طفل تسلی دے کر عدیل کمرے میں آگیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی معاملہ ہے۔ اس کے ذہن میں پہلے ہی تابانہ کے ردعمل کے مختلف اندیشے موجود تھے۔ وہ اسپتال جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، تاہم دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ معاملہ زیادہ سیریس نہ ہو اور وہ ہوش میں آجائے۔

ایسا ہی ہوا، کوئی ایک گھنٹے بعد جمیل ہی کی زبانی پتا چلا کہ اس کا معدہ واش کیا گیا ہے اور وہ ہوش میں آگئی ہے۔ یہ اطمینان بخش خبر تھی لیکن ابھی ایک اندیشہ موجود تھا۔ اقدام خودکشی کے اس معاملے میں کسی حوالے سے اس کا نام بھی آسکتا تھا۔ بہرحال اس حوالے سے بھی خیریت ہی گزری۔ یہ اقدام خودکشی کا معاملہ بنا ہی نہیں تھا۔ ایک تو اس کی ٹریٹ منٹ پرائیویٹ کلینک میں ہوئی تھی، دوسرے تابانہ نے بیان دیا تھا کہ اس نے غلطی سے دوا کی جگہ کیڑے مار محلول پی لیا تھا۔ (غالباً محلول بھی زیادہ مقدار میں نہیں پیا گیا تھا ورنہ کام لمبا ہو سکتا تھا)

وہ گھر آگئی تو الہام ایک بار پھر ضد کرنے لگی کہ وہ اس کو دیکھنے جائے گی۔ تب عدیل نے بیٹی کو علیحدگی میں تسلی سے سمجھایا اور بتایا کہ تابانہ اور اس کی والدہ کے بارے میں جو معلومات مل رہی ہیں ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ ان کا کردار مشکوک ہے۔ اس نے الہام کو اس اخباری خبر والی بات بھی بتائی جو اس کے چچا جمیل کے ہاتھ لگی تھی۔ الہام کو ان باتوں سے بہت شاک پہنچا...... اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ اُلجھن میں بھی نظر آئی جیسے ابھی تک اسے تابانہ کے متعلق باتوں پر پوری طرح یقین نہ آیا ہو، وہ اس میں شک کی گنجائش رکھ رہی ہو۔

اگلے دو تین ہفتے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ دو بار عدیل نے تابانہ کو گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھر کے سامنے والی سڑک پر سے فراٹے کے ساتھ گزر گئی تھی۔ ایک بار شاید اس نے عدیل کو اپنے گیٹ کے قریب کھڑے دیکھا بھی ہو مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے الہام سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے علاوہ عدیل کا یہ خدشہ بھی درست ثابت نہیں ہوا کہ وہ کوئی خط لکھے گی یا فون وغیرہ کرے گی۔

☆☆☆

عدیل ایک پیدائشی کھلاڑی تھا۔ شروع میں ہاکی کھیلی مگر پھر جب باکسنگ میں آیا تو باقی سب کچھ پس منظر میں چلا گیا۔ اب وہ باکسنگ کھیل تو نہیں پا رہا تھا مگر اس کھیل میں اس کی دلچسپیاں اسی طرح برقرار تھیں۔ ٹی وی اور یوٹیوب وغیرہ پر وہ باکسنگ کے مقابلے بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا۔ ہاکی اب ایک بھولی بسری محبوبہ کی طرح تھی۔ ہاں ''جمیل'' کو اب بھی ہاکی سے کچھ شغف تھا۔

ایک نیشنل ایونٹ کا فائنل ہو رہا تھا۔ جمیل ہر وقت اس کوشش میں رہتا تھا کہ بڑے بھائی کی روکھی پھیکی زندگی میں تھوڑا بہت چارم موجود رہے۔ وہ دوپہر کے وقت آیا اور اصرار کر کے عدیل کو اپنے ساتھ ہاکی اسٹیڈیم لے گیا۔ وہ فرسٹ کلاس پویلین میں بیٹھے۔ یہاں ہاکی کے نئے پرانے کھلاڑی موجود تھے لیکن ایک چیمپئن باکسر کی حیثیت سے عدیل کی شہرت تھی کہ لوگ ہاکی پلیئرز کو چھوڑ کر اس سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ ہاکی سے وابستہ کئی تلخ و شیریں یادیں عدیل کے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔

دونوں بھائی سہ پہر تین بجے کے قریب گھر لوٹے۔ پرانی ملازمہ نوراں کچھ پریشان نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ''صاحب جی، الہام بیٹی ابھی تک اسکول سے نہیں آئی۔''

عدیل اور جمیل بھی پریشان ہو گئے...... قریباً ایک گھنٹا اوپر ہو چکا تھا۔ عدیل نے اسکول فون کیا۔ پتا چلا کہ آخری اسٹوڈنٹ بھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے اسکول سے نکل چکی ہے۔ عدیل نے وین ڈرائیور کو کال ملائی۔ وین ڈرائیور کی اطلاع نے اہلِ خانہ کو مزید پریشان کر دیا۔ اس نے بتایا کہ قریباً ایک گھنٹا پہلے وہ خود الہام کو گھر کے گیٹ پر اتار کر گیا ہے۔

عدیل نے نوراں سے پوچھا۔ ''تمہیں بیل کی آواز نہیں آئی؟ اور وین والا بھی تو ہارن دیتا ہے۔''

''نہیں جی...... میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔ میں سارا وقت ڈرائنگ روم میں ہی رہی ہوں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، بابا شرفو کہاں ہے؟''

''وہ تو جی مہینے کا سودا لینے گیا ہوا ہے۔ اس نے بل بھی جمع کرانے تھے۔''

عدیل دوبارہ وین ڈرائیور کو فون کرنے کا سوچ رہا تھا جب جمیل ایک اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں الہام کا اسکول بیگ تھا۔ اسکول بیگ دیکھ کر نوراں کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''جھوٹ کیوں بولا ہے تم نے...... کہ الہام آئی ہی نہیں؟'' جمیل گرجا۔

''وہ...... وہ...... صاحب جی...... مجھے پتا نہیں چلا ہو گا۔ دراصل...... وہ......''

''دراصل تم سو گئی تھیں۔'' عدیل نے غصے میں اس کی بات مکمل کی۔ ''اور تمہاری نیند بھی ایچیوں سے کم نہیں ہوتی۔ وہ بیل دیتی رہی ہو گی اور پھر ''پرسنل کی'' سے دروازہ کھول کر اندر آ گئی ہو گی۔''

اس دوران میں جمیل نے سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر الہام کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ بالائی منزل کے کسی کمرے میں ہو یا پھر دھوپ سینکنے کے لیے چھت پر چلی گئی ہو بہرحال یہ خیال بھی خام ہی نکلا وہ اوپر کہیں نہیں تھی۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اڑوس پڑوس میں کہیں گئی ہے اور ابھی آ جاتی ہے۔ ''بھائی اس کو فون کر کے دیکھیں نا۔''

الہام اسکول میں فون نہیں لے جاتی تھی مگر گھر میں استعمال کرتی تھی۔ عدیل نے اسے کال کی تو فون کی بیل اندر کامن روم سے سنائی دینے لگی۔ فون بھی یہیں تھا۔ اسی دوران میں بابا شرفو بھی سامان سے لدا پھندا آ گیا۔ سب کو پریشان دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔ عدیل نے اسے صورتِ حال بتائی پھر بابا، شرفو اور نوراں سے کہا کہ وہ اڑوس پڑوس میں پتا کر کے آئیں۔ دفعتاً اسے تابانہ کا خیال بھی آ گیا۔ ممکن تھا کہ عدیل کو گھر میں نہ پا کر الہام اسی سے ملنے چلی گئی ہو۔ (حالانکہ ایسی نافرمانی وہ کرتی نہیں تھی) اس نے نوراں سے کہا۔ ''اور اس کی ٹیچر تابانہ کے گھر...... بھی دیکھ کر آؤ۔''

وہ ''اچھا صاحب جی'' کہتی ہوئی شرفو کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد سنگین تھا۔ عدیل اور جمیل پر انکشاف ہو رہا تھا کہ الہام گھر میں یا اردگرد کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ اسکول سے گھر آئی تھی۔ اس نے فریج کھول کر جوس پیا تھا اور یونیفارم بدلنے سے پہلے ہی اچانک کہیں غائب ہو گئی تھی۔ عدیل کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گا اور کبھی نہ اٹھ سکے گا۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالا ہوا تھا۔ جمیل اسے مسلسل تسلی دے رہا تھا۔ جمیل نے بابا شرفو اور نوراں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ ابھی الہام کے ''نہ ملنے کا ذکر'' کسی سے نہ کریں۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید گزرا۔ جمیل نے بے قراری سے کہا۔ ''کیا خیال ہے بھائی جان! پولیس میں اطلاع دینی چاہیے؟''

"دینی تو چاہیے لیکن......" وہ سخت تذبذب کے عالم میں خاموش ہوگیا پھر جیسے نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "چلو ایسے کرتا ہوں عرفان شیخ سے آف دی ریکارڈ بات کرتا ہوں۔"

عرفان شیخ، پولیس سروس کے وقت سے عدیل کا گہرا دوست تھا بلکہ پولیس اکیڈمی میں بھی وہ ساتھ ہی رہے تھے۔ عدیل نے مختصر لفظوں میں عرفان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ عرفان نے بھی وہی کہا جو عدیل کے ذہن میں بھی تھا۔ اس نے کہا۔ "ابھی رپورٹ نہیں کرانی چاہیے۔ اللہ کرے اگلے ایک دو گھنٹوں میں اس کا پتا چل جائے۔ ویسے میں اپنے طور پر دو چار ناکوں کو الرٹ کرتا ہوں۔"

عدیل کو لگ رہا تھا کہ وہ کھلی آنکھوں سے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ خود سے کہیں گئی ہو۔ اس کی جو دو چار فرینڈز تھیں، ان سے بھی پتا کیا جا چکا تھا۔ تازہ صورتِ حال جاننے کے لیے اسکول سے بھی دو کالز آچکی تھیں مگر عدیل اور جمیل نے یہ کالز ریسیو نہیں کی تھیں۔ ان کے دلوں سے بس ایک ہی دعا نکل رہی تھی کہ کوئی مثبت فون آجائے یا ڈور بیل ہو اور الہام دروازہ کھول کر اندر آجائے۔

شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح عدیل کے ذہن میں کوندا۔ اسے وہ تھپڑ یاد آیا جو چند دن پہلے اس نے تابانہ کے منہ پر مارا تھا۔ پھر اس کا سرخ ہوتا چہرہ، اور اس کا تیزی سے باہر نکل جانا یاد آیا، پھر وہ واہیات حرکت جب اس نے زہریلی دوا پی تھی۔ وہ ایک علیحدہ ٹائپ کی لڑکی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں عدیل کو ہمیشہ ایک جدا قسم کی کیفیت لشکارے مارتی دکھائی دی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسی نے الہام کے ساتھ کچھ کر ڈالا ہو۔ اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہیں بھائی؟" جمیل نے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ میں الہام کی ٹیچر تابانہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

نوراں چونک کر بولی۔ "لیکن صاحب جی! وہاں تو تالا لگا ہوا ہے۔ میں نے ساتھ والے خواجہ جی سے پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ دونوں صبح سے گھر پر نہیں ہیں۔ گھر میں کام کرنے والی بھی بیل بجا، بجا کر چلی گئی تھی۔"

عدیل کے ذہن میں پلنے والا اندیشہ ایک دم جوان ہونے لگا۔ اس نے اسی وقت تابانہ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ وہ فوراً جمیل کو لے کر تابانہ کے گھر پر پہنچا۔ گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پڑوسیوں نے وہی بات بتائی جو اس سے پہلے نوراں نے بتائی تھی۔ عدیل نے گھر واپس پہنچتے ہی جمیل کو وہ سب کچھ بتا دیا جو تابانہ کے حوالے سے پیش آچکا تھا۔ اس کی پیش قدمیوں سے لے کر اس کے خط اور اپنے تھپڑ تک اس نے کچھ بھی چھوٹے بھائی سے نہیں چھپایا۔

جمیل بولا۔ "بھائی! میں تو وہ اخباری خبر دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ ٹھیک فیملی نہیں ہے۔ الہام کے ساتھ تابانہ کا میل جول مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ "سیدھی سادی الہام" کو اپنے ہاتھوں پر ڈال رہی تھی مگر یہ سوچنا پڑے گا کہ اتنا سنگین قدم وہ واقعی اٹھا سکتی ہے یا نہیں۔"

اسی دوران میں شرفو بابا ہانپا ہوا سا کمرے میں آیا۔ اس نے کہا۔ "عدیل بیٹا...... وہاں گیٹ کے پاس کیاری میں دو چھوٹے گملے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ذرا آپ بھی آکر دیکھیں۔"

عدیل اور جمیل فوراً باہر لان میں پہنچے۔ گراسی لان میں گارڈن لائٹس موجود تھیں۔ بابا شرفو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مٹی کے دو گملے ٹوٹے ہوئے تھے اور کیاری میں کچھ ایسے نشان بھی تھے جیسے وہاں کسی کا پاؤں رپٹا ہو۔ گملوں کا ٹوٹنا، بلیوں وغیرہ کی کارستانی بھی ہو سکتی تھی مگر یہ پاؤں کے گھسٹنے کا نشان جو کچی مٹی پر واضح نظر آ رہا تھا، کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

الہام نے عدیل کو بتایا تھا کہ وہاں جوڈو کلب میں کوئی وارثی نام کا منیجر بھی ہے، تابانہ اور اس کی والدہ دونوں اس پر بے حد اعتماد کرتی ہیں۔ کسی وقت تو تابانہ کلب کی ساری ذمے داری ہی اس پر ڈال دیتی ہے۔

عدیل نے جمیل کو ساتھ لیا اور اسی وقت دونوں تابانہ کے کلب جا پہنچے۔ یہ کمرشل علاقے میں ایک کشادہ عمارت تھی۔ چھت پر نیو ایج ہیلتھ کلب کا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ منیجر وارثی لمبے بالوں اور فرنچ کٹ داڑھی والا ایک چھبیس ستائیس سالہ نوجوان تھا۔ عدیل اور جمیل نے اس کے ساتھ تند و تیز لہجہ اختیار کیا اور پوچھا کہ تابانہ اور اس کی والدہ کہاں ہیں؟

وہ ان دونوں کے انداز سے بہت گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ "شاید آپ کی بیٹی ابھی تک گھر نہیں آئی ہیں اور اس سلسلے میں آپ مس تابانہ پر کسی طرح کا شک کر رہے ہیں۔ وہ اور ان کی والدہ ایسی نہیں ہیں......"

''ہم نے تم سے اُن دونوں کی صفائی نہیں مانگی۔ بس وہ بتاؤ جو کچھ پوچھ رہے ہیں۔'' جمیل نے کڑا لہجہ اختیار کیا۔

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''اللہ جانتا ہے۔ میں آپ سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ کل شام مس تابانہ نے سارا چارج میرے حوالے کر دیا تھا اور کہا تھا کہ انہیں کچھ دنوں کے لیے ایمرجنسی طور پر کہیں جانا پڑ رہا ہے۔''

''کہاں جانا پڑ رہا ہے؟'' عدیل نے آتشیں انداز میں پوچھا۔

''میں نے پوچھا لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔ نہ ہی بتایا کہ کتنے دنوں تک واپسی ہو جائے گی۔ ویسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شہر سے باہر ہی کہیں جا رہی ہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' عدیل پھنکارا۔ ''ہماری اطلاعات یہی ہیں کہ تابانہ کے چھوٹے سے چھوٹے پروگرام اور پلان کے بارے میں بھی تمہیں پتا ہوتا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کئی روز کے لیے کہیں نکل گئی ہو اور تمہیں اپنی منزل کا نہ بتایا ہو۔''

''مم...... میں خود بھی اس پر حیران تھا سر۔ میں نے دوسری، تیسری بار پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ہو سکتا ہے کہ میڈم تنویر (تابانہ کی والدہ) نہ جائیں۔ اگر وہ آئیں تو تفصیل بتا دیں گی۔

جمیل نے اپنا ہاتھ وارثی کے گریبان تک پہنچانا چاہا لیکن عدیل نے روک دیا۔ لڑائی جھگڑے میں اس سنگین واقعے کی تشہیر تھی اور وہ تشہیر سے بچنا چاہ رہا تھا۔ وارثی گہرا بندہ لگتا تھا مگر کسی وقت یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کم از کم اس معاملے میں سچ ہی بول رہا ہے۔ عدیل اور جمیل نے وارثی کا موبائل فون بھی چیک کیا۔ کل شام تابانہ جوڈو کی کلاس کے لیے کلب آئی تھی۔ اس کی آمد سے پندرہ منٹ پہلے اس کی ایک کال وارثی کے لیے آئی تھی اور یہ آخری تھی۔

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ گزرنے والے ہر پل کے ساتھ عدیل کا دل جیسے ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ عدیل اور جمیل نے منیجر نما وارثی کو بڑی سختی سے ہدایت کی کہ وہ فی الحال الہام کے لاپتا ہونے کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔ وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ''سر! آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ یہ نازک معاملہ ہے۔''

بندہ ٹھیک لگ رہا تھا پھر بھی کلب سے نکلتے ساتھ ہی عدیل نے دوست ایس پی عرفان کو فون کیا اور اسے وارثی اور تابانہ کا نام کرنے کے بعد کہا کہ وہ ان دونوں نمبروں اور ان کے IMEI پر ٹریکنگ لگوائے۔ اب جمیل کے لیے بھی ضروری ہو چکا تھا کہ گھر کال کر کے کم از کم آمنہ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دے۔ آمنہ کو کال کرنے کے بعد عدیل اور جمیل پھر گھر واپس آ گئے۔ نوراں خود کو اس نہایت سنگین مصیبت کا ذمے دار سمجھ رہی تھی۔ رو، رو کر اس کا برا حال تھا۔ بابا شرفو بھی غم کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس نے الہام ہی کو نہیں عدیل اور جمیل کو بھی انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ (جب ہاکی کا کھیل چھوڑ کر عدیل اسلام آباد کی پولیس اکیڈمی میں چلا گیا تھا تو بابا شرفو بیمار پڑ گیا تھا) عدیل نے بابا شرفو کو گلے سے لگا کر کہا کہ وہ چاہے اور کچھ نہ کریں لیکن دعا مسلسل ضرور کرتے رہیں۔ اس نے نوراں کا رونا دھونا بھی بند کرایا اور اسے دعا کے لیے کہا۔

سردیوں کی وہ طویل رات بہت ..... بوجھل تھی۔ کسی مہلک اژدھے کی طرح ان کو اپنے حصار میں جکڑتی چلی جا رہی تھی مگر پھر اس رات نے اچانک ایک کروٹ لی۔ عین اس وقت جب عدیل اور جمیل پولیس اسٹیشن میں باقاعدہ رپورٹ درج کرانے کا سوچ رہے تھے، ایس پی عرفان کی طرف سے ایک کال موصول ہو گئی۔ اس نے جذباتی انداز میں بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے صرف تیس چالیس سیکنڈ کے لیے تابانہ کا نمبر آن ہوا ہے اور اس نے وارثی والے نمبر پر بات کی ہے۔

''نمبر کی لوکیشن؟'' عدیل نے پوچھا۔

''شیخوپورہ...... میں نے وہاں کے مقامی افسران سے رابطہ کر لیا ہے۔ سروس پرووائیڈرز بھی رابطے میں ہیں۔ لگتا ہے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ایگزیکٹ لوکیشن کا پتا بھی چل جائے گا۔''

عدیل کے سینے میں امید کی لہریں جاگ گئیں۔ جمیل کا چہرہ بھی سرخ نظر آنے لگا تھا۔ جمیل نے وارثی کا نمبر پریس کیا اور عام سے انداز میں اس سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی، کسی طرح کی کوئی خبر؟''

''نن...... نہیں سرجی۔ میں بھی ویٹ ہی کر رہا ہوں۔'' شور سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی گاڑی میں سفر کر رہا ہے۔

''کہاں ہو تم؟'' جمیل نے استفسار کیا۔

''کل کلب میں تو چھٹی ہے۔ ذرا اپنے کام سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تابانہ یا اُس کی والدہ سے کوئی رابطہ ہو تو فوراً بتاؤ، ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔''

"آ......آپ بے فکر رہیں جی۔ آپ سے جو کمٹ منٹ کی ہے، پوری کروں گا۔"

واضح ہو چکا تھا کہ وارثی بھی دھوکا دے رہا ہے۔ اب پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ خیر گاڑی میں تو وہ موجود تھا۔

عدیل نے ایک بار پھر ایس پی عرفان سے رابطہ کیا پھر دونوں شیخوپورہ جانے کے لیے نکل پڑے...... تابانہ کا نمبر مسلسل بند جارہا تھا۔ عدیل کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب اپنی واہیات حرکت پر عدیل سے تھپڑ کھانے کے بعد تابانہ کا چہرہ پہلے زرد اور پھر سرخ ہوا تھا۔ ان لمحوں میں اس کے چہرے پر جو کیفیت نظر آئی تھی، اس نے اکثر عدیل کو "ہانٹ" کیا تھا۔ اپنی لاڈلی کی عافیت کے لیے عدیل کے دل سے مسلسل دعائیں نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

ابھی عدیل اور جمیل شیخوپورہ سے چار پانچ کلومیٹر دور ہی تھے کہ عرفان شیخ کی کال آگئی۔ اس نے دو اہم خبریں دیں۔ ایک یہ کہ تابانہ کا موبائل ایک بار پھر چار پانچ سیکنڈ کے لیے آن ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ وارثی کے موبائل کی لوکیشن بتا رہی ہے کہ وہ اسلام آباد کے بجائے مغربی رخ پر شیخوپورہ کی طرف جارہا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اسے شیخوپورہ کے داخلی راستے پر روک لیا جائے۔ وہاں پہلے سے ایک ناکا موجود تھا۔

وارثی کی غلط بیانیاں اب ثابت ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب چار پانچ منٹ بعد عرفان شیخ نے عدیل کو یہ خوش خبری سنائی کہ اسے ناکے پر پکڑ لیا گیا ہے تو عدیل کے اندر آس امید کے دیے کچھ اور روشن ہو گئے۔ ان دونوں کے متذکرہ ناکے پر پہنچنے تک وارثی کو چند طمانچے بھی پڑ چکے تھے۔ وہ مقامی ایس ایچ او کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں جوڑ رہا تھا۔ عدیل اور جمیل کو دیکھ کر اس کا رنگ اور زرد ہو گیا۔

عدیل اور جمیل نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ یہ پوچھ گچھ تاریکی میں کھڑی پولیس موبائل کے اندر ہی ہوئی۔ وارثی کی اپنی سوزوکی مہران سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ وارثی نے بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہوئے بتایا کہ اسے اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے مس تابانہ نے اسے ہنگامی طور پر شیخوپورہ بلایا ہے...... وہ ان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جارہا تھا۔ مس اور میڈم نے اس سے کیا کہنا تھا، یہ اسے وہاں جا کر ہی معلوم ہونا تھا۔

وارثی کے ہاتھ آجانے سے دو بہت اہم فائدے ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ فون ٹریسنگ کے ذریعے تابانہ کی ایگزیکٹ لوکیشن ڈھونڈنے کی محنت نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ تابانہ تک پہنچے اور اسے محفوظ طریقے سے چھاپنے میں وارثی سے مدد لی جاسکتی تھی۔ اگر واقعی الہام، تابانہ کے قبضے میں تھی۔ (اور شواہد بتا رہے تھے کہ اس کا بہت زیادہ امکان ہے) تو پھر تابانہ کو گرفت میں لانے کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اسی اثنا میں عرفان شیخ بھی پرائیویٹ کار میں پرائیویٹ حیثیت سے اس ناکے پر پہنچ گئے اور پلاننگ میں شریک ہو گئے۔

اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تابانہ شیخوپورہ کی ایک نئی رہائشی کالونی کی ایک سنگل اسٹوری عمارت میں موجود تھی۔ پلاننگ کے مطابق وارثی نے کوٹھی کی ڈور بیل دی۔ اس کے ساتھ عرفان شیخ سادہ کپڑوں میں تھے۔ دروازہ خود تابانہ .... نے کھولا۔ وارثی نے عرفان شیخ کے بارے میں بتایا کہ یہ اس کے ماموں ہیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر گلی کے موڑ پر مل گئے ہیں۔ ذرا جزبز دکھائی دینے کے بعد تابانہ .... نے انہیں اندر آنے دیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وارثی کے ساتھ پولیس ہے۔

عدیل، جمیل اور عرفان کا ڈرائیور گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر گاڑی میں موجود تھے۔ عرفان شیخ کی لمبی قمیص کے نیچے بھرا ہوا سروس پسٹل موجود تھا۔ انہوں نے عدیل کو یقین دلایا تھا کہ اگر الہام اندر موجود ہے تو وہ اس کے لیے کسی طرح کا رسک نہیں لیں گے۔ عدیل کو عرفان کے تجربے پر بھروسا تھا۔

وہ چند منٹ عدیل اور جمیل کے لیے بے حد کرب ناک تھے۔ پھر گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور وارثی کی شکل نظر آئی۔ اس نے گاڑی کے پاس آکر کہا۔ "اندر آجائیں جی۔ ایس پی صاحب بلا رہے ہیں۔"

اسی دوران میں عدیل کے فون پر عرفان کی کال بھی آگئی۔ اس نے کہا۔ "عدیل پریشانی کی بات نہیں، اندر آجاؤ۔"

عدیل اور جمیل کوٹھی کے لان سے گزر کر کامن روم میں پہنچے۔ تابانہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھی۔ بال منتشر تھے۔ وہ عرفان سے تکرار کررہی تھی۔ عدیل کو دیکھ کر دم بخود ہو گئی۔ اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ عدیل کو اپنے رُوبرو دیکھ رہی ہے۔

"ماں کدھر ہے تمہاری؟" عرفان نے پولیس والوں کے کڑک لہجے میں پوچھا۔

"وہ...... دوا کھا کر پچھلے کمرے میں سو رہی ہیں۔ طبیعت خراب ہے اُن کی۔"

"طبیعت تو تمہاری بھی بہت خراب ہو جائے گی اگر تم نے سچ نہ بولا تو......"

تابانہ گھبرا کر عدیل کی طرف آئی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ یہ مجھ سے الہام کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا ہوا ہے اُسے؟"

"ان سوالوں کے جواب تو تمہارے پاس ہیں۔" عدیل سرسراتے لہجے میں بولا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ عرفان شیخ نے کہا۔ "ان دو چار کمروں میں تو الہام کہیں نظر نہیں آ رہی۔ میں باقی جگہوں پر دیکھتا ہوں۔"

عرفان کے باہر نکلتے ہی عدیل نے جمیل اور وارثی وغیرہ کو بھی باہر بھیج دیا۔ اس کے سینے میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ اس نے تابانہ کے منتشر بال مٹھی میں جکڑے اور پھنکارا۔ "تابانہ! میں تیری جان لے لوں گا اور اپنی جان دے دوں گا۔ بتا میری بچی کے ساتھ کیا کیا ہے تو نے؟ کہاں ہے وہ؟" شدتِ اندوہ سے عدیل کا گلا رُندھ گیا۔

وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔ "مجھے کچھ پتا نہیں ہے اس کا...... میں تو......" اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی عدیل کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ پھر ایک اور...... پھر ایک الٹے ہاتھ کا۔ عدیل غم و غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ تابانہ کے ڈیانا کٹ بال بدستور اس کی مٹھی میں تھے۔

تابانہ کے نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی یلغار تھی۔ یہی وقت تھا جب بغلی دروازہ کھلا اور تابانہ کی قدرے فربہ اندام والدہ نائٹ گون پہنے نمودار ہوئی۔ کمرے کا منظر دیکھ کر اس نے چلانا شروع کر دیا۔ "ہائے میری بچی، ہائے کیا ہوا اِس کو...... کیوں مار رہے ہو؟"

وہ عدیل پر جھپٹی اور اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ عدیل کا چہرہ انگارا ہو رہا تھا۔ وہ میڈم تنویر پر دھاڑا۔ "میری بچی کہاں ہے؟"

یہی وقت تھا جب عرفان شیخ اور جمیل وغیرہ اندر آ گئے۔ اسی اثنا میں عدیل کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے فون نکالا اور اسکرین پر نمبر دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے فون کان سے لگایا اور ہانپی آواز میں بولا۔ "کون؟"

جواب میں بھاری آواز سنائی دی۔ "تمہارا پرانا دوست، ہمدرد، خیرخواہ......"

"کون؟ جمشید خاں؟" عدیل نے آواز پہچان کر کہا۔

"سو فیصد...... بلکہ آج تو سو فیصد سے بھی زیادہ۔" بولنے والا نشے میں لگتا تھا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر بڑے اطمینان سے کہا۔ "دو بار پہلے بھی فون کیا تھا مگر اٹینڈ ہی نہیں ہوا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بچی کی رپورٹ ہی درج نہ کرا دو تم...... درج تو نہیں کرائی نا؟"

عدیل کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا خون اس کے سر کو چڑھنے لگا ہے۔ یہ بندہ کس لہجے میں بات کر رہا تھا۔ "کس بچی کی بات کر رہے ہو تم؟" عدیل چلّایا۔

"یار! تمہاری بچی کی اور کس کی۔ اور تمہاری بچی کیا، اپنی ہی ہوئی نا۔ میرے پاس ہے اِس وقت۔ اور بڑے آرام سے ہے۔ سمجھو کہ آج اپنے باپ کے گھر میں نہیں تایا کے گھر میں سو رہی ہے۔"

غصے اور غم کی شدت سے عدیل کا سارا جسم پتے کی طرح لرزنے لگا۔

ایس پی عرفان شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کون ہے یہ؟ عدیل نے ہاتھ ہی کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کا کہا اور مخاطب سے بات کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے ہیجانی انداز میں سرگوشی کی۔ "جمشید خاں! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے میری بیٹی کو اغوا کر لیا ہے؟"

وہ ہنسا۔ "اس کو اغوا کہہ کر تم خود کو مزید ہلکان کیوں کر رہے ہو۔ میں تو بچی کو ذرا آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے یہاں لے آیا ہوں۔ دو چار دن یہاں رہے گی۔ کھائے پیے گی تھوڑی سی اور جوان اور صحت مند ہو کر واپس آئے گی۔"

"جمشید خاں! میری بچی کو چھوڑ دو۔ میں مار دوں گا اور مر جاؤں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔" عدیل جنونی انداز میں بولا۔

"ایزی چیمپئن ایزی...... بات کو اتنا آگے مت لے جاؤ کہ پھر واپس لانا مشکل ہو جائے۔ مسئلہ اتنا بڑا نہیں ہے لیکن اگر بڑا کرتے جاؤ گے تو پھر بڑا ہوتا جائے گا۔"

"کیا چاہتے ہو تم...... کیا چاہتے ہو؟" عدیل اتنی زور سے دھاڑا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"تمہارے سوال پر ہنسنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔ جو میں چاہتا ہوں تم اچھی طرح جانتے ہو، بلکہ کئی ماہ سے جانتے ہو۔"

"تم...... تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ تم جانتے ہو کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ میں نہیں کر سکتا، وہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

"بس میں ہو جائے گا...... بالکل ہو جائے گا۔ تمہاری بھی، تمہیں اس قابل بنا دے گی کہ تم یہ کر سکو۔"

آخری فقرہ اس نے ایسے دھمکی آمیز انداز میں کہا تھا کہ عدیل کی رگوں میں آگ دوڑ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ انڈر ورلڈ کا یہ شیطان اس کے سامنے ہو اور وہ اپنی اور اس کی جان ایک کر دے۔ سخت سردی میں اس کا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ اچانک اسے لگا کہ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا ہے۔ "جمشید خاں...... جمشید خاں......" وہ دہاڑا مگر فون بند ہو چکا تھا۔

"کیا ہوا؟ کون تھا بھائی جان؟" جمیل نے پوچھا۔

عدیل بے دم سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "پانی لاؤ جلدی۔" عرفان نے ڈرائیور سے کہا۔

جمیل بھی جان گیا کہ فی الحال عدیل سے سوال جواب مناسب نہیں ہے۔

عدیل نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن میں کھلبلی سی تھی۔ جمشید خاں کا گھنی مونچھوں والا چوڑا چکلا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ جمشید خاں کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا۔ وہ اسمگلنگ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی جمشید خاں ہر وہ جائز اور ناجائز کام کر گزرتا تھا جس میں اُسے پیسا نظر آتا تھا۔ کئی شعبوں میں اس کے فرنٹ مین موجود تھے۔ ایسا ہی ایک فرنٹ مین ظہور بادا کھیلوں کے شعبے میں بھی تھا۔ ظہور بادا سے عدیل کی پہلی ملاقات کوئی ڈیڑھ سال قبل ہوئی تھی۔ باکسنگ کے ایک نیشنل ایونٹ میں عدیل کو تقسیم انعامات کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ وہیں پر خوش پوش اور طرح دار ظہور سے عدیل کی گفتگو ہوئی تھی۔ بعد ازاں ظہور نے ایک طویل ٹیلی فونک گفتگو میں عدیل سے کہا تھا کہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر اب بھی لاکھوں لوگ اسے پھر سے باکسنگ کے رِنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر زیادہ نہیں تو صرف ایک بار ہی عدیل کسی بین الاقوامی مقابلے میں نظر آ جائے تو نوٹوں کی بارش ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ظہور بادا نے عدیل کے پرانے حریف ایک تھائی باکسر اناڈا کا نام لیا تھا۔ اناڈا، تھائی لینڈ کا رہنے والا تھا اور اتفاقاً عدیل کی طرح اس کا تعلق بھی ماضی میں پولیس کے محکمے سے رہا تھا۔ ایک مقابلے میں عدیل نے اس کی ناک فریکچر کر دی تھی۔ اس کے بعد سے دونوں میں زبردست قسم کی نسل چل پڑی تھی۔ ماضی میں ان دونوں کے تین چار مقابلے مختلف پلیٹ فارمز پر ہوئے تھے اور یہ پُرجوش مقابلے شائقین نے غیر معمولی اشتیاق سے دیکھے تھے۔ پورے جنوبی ایشیا میں ان کا چرچا ہوا تھا۔ اناڈا ابھی تک باکسنگ کے کھیل سے وابستہ تھا۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو میں ظہور بادا نے عدیل کو ایک خطیر رقم کی پیشکش کی اور درخواست کی کہ وہ اناڈا سے دس راؤنڈ کا ایک مقابلہ کر لے۔ ڈیڑھ سال پہلے عدیل نے ظہور کی اس آفر کو سختی سے رد کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کی کمر کی حالت ایسی نہیں کہ وہ پھر سے باکسنگ کے رِنگ میں اتر سکے۔ اگر عدیل کا خیال تھا کہ یہ بات یہیں پر ختم ہو جائے گی تو یہ غلط تھا۔ پچھلے ڈیڑھ برس میں یہ بات نہ صرف جاری تھی بلکہ مزید سنگین ہو گئی تھی۔ یہ ظہور بادا ان لوگوں سے زیادہ ڈھیٹ نکلا تھا جو عدیل کو اس طرح کی پیشکش کرتے رہتے تھے۔ خود ناکام ہونے کے بعد وہ ایک نہایت خطرناک بندے کو بیچ میں لے آیا تھا۔ یہ اس کا باس جمشید خاں تھا۔ جمشید خاں ہر ڈیڑھ دو ماہ بعد اسے فون کر دیتا تھا۔ مختلف طریقوں سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یوں تو اس کا لب و لہجہ شائستہ ہی ہوتا تھا مگر کبھی کبھی اس شائستگی کے اندر ایک شعلہ سا لپکتا بھی محسوس ہوتا تھا۔ جمشید خاں سے عدیل کی آخری ٹیلی فونک گفتگو تقریباً دو ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اس نے ذرا جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"یار! تم ایک ہی چکر میں گھومتے چلے جا رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری کمر کی تکلیف روپے میں سے پچانوے پیسے تمہارا وہم اور خوف ہے۔ تم ایک دفعہ باکسنگ رِنگ میں کود پڑو تو یہ سارے وہم اُڑن چھو ہو جائیں گے۔ میں پچھلے دنوں سنگاپور میں تھا۔ میں نے وہاں ایک ماہر آرتھوپیڈک سرجن سے تمہاری اس لاڈلی کمر کے بارے میں تفصیل سے بات کی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ اگر تم چاہو تو وہ یہاں پاکستان آ کر بھی تمہارا معائنہ کر سکتا ہے۔"

عدیل نے بمشکل اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔ "معائنے کی بات نہیں ہے جمشید صاحب! یہ صرف سرجری کا معاملہ ہے اور ریڑھ کی سرجری جتنی پیچیدہ ہوتی ہے شاید آپ کو پتا نہیں۔"

وہ عجیب لہجے میں بولا تھا۔ "مجھے تو سرجری سے زیادہ

تم پیچیدہ لگتے ہو۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ تم نے بس ضد پکڑ لی ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ضد بازیاں اچھی نہیں ہوتیں۔''

اُس نے عدیل سے کہا تھا کہ عدیل نے ضد پکڑ لی ہے۔ حالانکہ ضد وہ پکڑے بیٹھا تھا اور آج اس کی یہ ڈیڑھ برس پرانی ضد ایک نہایت سنگین واردات پر ختم ہوئی تھی۔ آنکھیں موند کر کرسی پر بیٹھے، بیٹھے عدیل پسینے میں نہا گیا۔ دفعتاً اسے تابانہ کا خیال آیا اور ان طمانچوں کا خیال آیا جو اس نے تابانہ کے منہ پر مارے تھے اور خون کی اس سرخی کا خیال آیا جو اس کے نچلے ہونٹ پر دکھائی دی تھی۔ ''اوہ گاڈ۔'' وہ بڑبڑایا اور تیزی سے اٹھ کر تابانہ والے کمرے میں پہنچا۔ وہ اپنے ہونٹ پر روئی رکھے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی والدہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ عدیل کو اپنی طرف آتا دیکھ کر تابانہ سہم گئی۔ اس کی والدہ ڈھال کی طرح اس کے سامنے آگئی۔ ''خدا کے لیے ہوش کرو۔ میری بچی کچھ نہیں جانتی تمہاری الہام کے بارے میں۔ یہ تو خود ڈر مر کر یہاں چھپی بیٹھی ہے۔'' میڈم نے دوہائی دی۔

عدیل چند لمحے کمرے کے وسط میں ساکت کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا پھر وہ بھیگے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ''تابانہ! میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو، میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔''

تابانہ نے اشک بار نگاہوں سے ذرا چونک کر عدیل کی طرف دیکھا۔ تب اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو اُبل پڑے۔ وہ امید بھرے لہجے میں بولی۔ ''کچھ پتا چلا الہام کا؟''

''ابھی نہیں، لیکن کچھ کھوج مل گیا ہے...... ویسے...... وہ بالکل محفوظ ہے۔'' عدیل نے سر جھکائے جھکائے کہا اور مڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

عرفان شیخ اور جمیل بے قراری سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عرفان شیخ نے عدیل کو کھوجتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''کہیں یہ وہی حرام زادہ جمشید خاں تو نہیں؟''

عدیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایس پی عرفان کا چہرہ اتر گیا۔ جمیل بھی اس تصدیق کے بعد زرد زرد نظر آنے لگا۔ وہ دونوں تھوڑا بہت اس کھینچا تانی کے بارے میں جانتے تھے جو عرصے سے عدیل اور انڈر ورلڈ کے جمشید خاں کے درمیان جاری تھی۔ لیکن یہ کھینچا تانی ایک دن ایسا رخ اختیار کر لے گی، یہ ان دونوں نے بھی نہیں سوچا تھا۔ ایس پی عرفان بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جمشید جیسے روپوش مجرموں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ منظر پر موجود ہی نہیں ہوتے...... اور اُن کے جو فرنٹ مین موجود ہوتے ہیں وہ بھی اکثر اپنے سرغنہ کی WHERE ABOUT کے بارے میں نہیں جانتے۔ عرفان کے ساتھ ساتھ عدیل کو بھی یقین تھا کہ اگر جمشید کے فرنٹ مین ظہور بادا کو پکڑ بھی لیا جائے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کا الٹا اثر یہ ہوسکتا تھا کہ طیش میں آ کر جمشید خاں، الہام کو کوئی نقصان پہنچا دیتا۔ بے شک وہ الہام کو ''میری بچی'' کہہ رہا تھا مگر اس جیسے بدمعاش سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ جمشید خاں نے جس نمبر سے فون کیا تھا اس کو ٹریس کرنے کی کوشش حماقت تھی۔

وہ کچھ دیر آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ان تینوں کی سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ انہیں اس معاملے میں جلد بازی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

☆☆☆

اب دن طلوع ہو چکا تھا لیکن عدیل کو یہی لگ رہا تھا کہ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ وہ اور جمیل ابھی تک شیخوپورہ کے اسی گھر میں تھے جہاں تابانہ اور اس کی والدہ موجود تھیں۔ عدیل کا دوست عرفان واپس لاہور چلا گیا تھا۔ اسے اپنے کسی آفیسر کا بلاوا آیا تھا۔ رات کو جس نمبر سے جمشید خاں نے فون کیا تھا وہ اب بند تھا۔ عدیل شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ دوبارہ اس بدبخت کا فون آئے۔ رونے کی وجہ سے تابانہ کی آنکھیں سرخ تھیں تاہم اب اس نے خود کو قدرے سنبھالا ہوا تھا۔ اس کا زخمی ہونٹ تھوڑا سا سوجا ہوا تھا اور اس کی دید عدیل کو بے چین کر دیتی تھی۔ عدیل کو اس کی والدہ میڈم تنویر کا وہ جملہ یاد آیا جو انہوں نے رات کو بولا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میری بیٹی تو خود ڈر سہم کر یہاں چھپی ہوئی ہے۔ عدیل نے تابانہ سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ اپنی سرخ ناک کو ٹشو پیپر سے رگڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ وہی کلب والا جھگڑا ہے جی۔ وہ لوگ اوچھے ہتھکنڈوں پر اترے ہوئے ہیں۔ بس وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا کلب بند ہو جائے۔ ایک دو خطرناک غنڈے بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ماما کو لے کر خاموشی سے یہاں چلی آئی ہوں۔'' اس کی سیاہ آنکھوں میں پھر نمی جاگ گئی۔

کہتے ہیں کہ جس کی چوری ہو جائے اس کے لیے ہر کوئی چور ہی ہوتا ہے۔ شاید عدیل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ الہام کی گمشدگی کے روز ہی تابانہ اور اس کی والدہ کا

اپنے گھر سے اوجھل ہو جانا ان کو عدیل اور جمیل کی نگاہوں میں مشکوک ٹھہرا گیا تھا پھر کلب کے نگراں وارثی نے جو الٹی سیدھی باتیں کیں، اس کی وجہ سے عدیل اور جمیل کا شک مزید گہرا ہوا۔ مگر اب یہاں پہنچنے کے بعد بالکل مختلف صورت حال سامنے آئی تھی۔ ماں بیٹی اپنے کلب کے تنازعے کی وجہ سے ہی منظر سے اوجھل ہوئی تھیں۔ غم و اندوہ کی ہیجانی کیفیت میں عدیل نے تابانہ سے جو سلوک کیا تھا، وہ اسے مزید شرمندہ کررہا تھا۔ اب عدیل پر یہ بات بھی کچھ کچھ واضح ہورہی تھی کہ تابانہ کے ہیلتھ کلب کے بارے میں جو ناروا باتیں کہی گئی تھیں وہ بھی کاروباری رقابت کا ہی شاخسانہ تھیں۔

میڈم تنویر نے آزردہ لہجے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کلب ممبرز میں سے آرائیں برادری کی دو لڑکیاں ایسی تھیں جن کے رشتے میری کوشش سے طے ہوئے اور ایسا ان لڑکیوں اور ان کے والدین کی رضامندی سے ہوا۔ آج کل کے رواج کے مطابق لڑکیوں اور لڑکوں کو ایک دو دفعہ ایک دوسرے سے ملایا بھی گیا تاکہ وہ کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ بس ہمارے مخالفوں نے اسی بات کا بتنگڑ بنایا اور بہتان باندھ دیے۔ حالانکہ ان دونوں لڑکیوں کی شادی ہوچکی ہے اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ ہنسی خوشی ہیں۔''

میڈم تنویر نے تابانہ کے موبائل پر ان شادیوں کی تصاویر بھی دکھائیں۔ عدیل اور جمیل نے تابانہ اور میڈم تنویر سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ عدیل نے تابانہ سے کہا کہ وہ ایس پی عرفان سے بات کرے گا۔ مخالف کلب والوں کو قانون کے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیا جائے گا۔ اس نے میڈم تنویر سے کہا کہ وہ اس طرح چھپ کر نہ بیٹھیں۔ بہتر ہے کہ ابھی لاہور واپس چلیں۔ ماں بیٹی سمجھتی تھیں کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتیں پھر بھی وہ ابھی چند دن یہاں گزارنا چاہتی تھیں۔

دوپہر کے بعد جب میڈم تنویر کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے سوگئیں تو عدیل کو تابانہ سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے رویّے پر تابانہ سے معذرت کی۔ تابانہ بھی الہام کے سلسلے میں بے حد فکرمند تھی۔ جیسے وہ صرف اس کی شاگرد نہ ہو، چھوٹی بہن یا بیٹی ہو۔ یہ فکرمندی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے صاف جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''سر! پلیز مجھے بتائیں میں اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہوں۔ یقین کریں سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے والا ہوگیا ہے۔''

''فی الحال تو تم دعا ہی کرو تابانہ اور اپنی امی سے بھی کہو۔ اس بندے کا فون دوبارہ آئے، تو پھر ہی کچھ سوچا جاسکتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''آپ اور جمیل کسی ظہور بادا کی بات کررہے تھے۔ یہ نام میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ جمیل شاید کہہ رہا تھا کہ یہ جمشید خاں کا فرنٹ مین ہے۔''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''سر! یہ شخص تو انڈر گراؤنڈ نہیں ہے نا۔ کیوں نا اسی پر ہاتھ ڈالا جائے۔ پولیس والے تو پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ ایس پی عرفان آپ کا دوست ہے۔''

''نہیں تابانہ، اس رخ پر ہم نے بھی سوچا ہے۔ اس سے ہماری اور الہام کی مشکلات میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔''

یکایک عدیل کے موبائل پر کال کے سگنل آئے۔ وہ جیسے سرتاپا ہل گیا۔ جلدی سے اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ یہ وہی منحوس نمبر تھا جسے ٹریس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عدیل کال ریسیو کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جمشید خاں کی قدرے باریک لیکن نہایت تیکھی آواز سنائی دی۔ بالکل جیسے تلوار کی دھار ہو۔ وہ بلاتمہید سرد لہجے میں بولا۔ ''چیمپ عدیل! پہلے تو میں تمہیں یہ بات بتادوں کہ اپنے یار ایس پی شیخ یا کسی اور پولیس والے کی گندی ناک اس معاملے میں گھسیڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے تمہاری بچی کو بچی کہا ہے اور بڑے احترام اور لاڈ سے اپنے پاس رکھا ہے۔ یہ ''احترام'' اور لاڈ برقرار ہی رہے تو بہتر ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں پھر ایک آتشیں دھمکی برق کی طرح کوندی۔

''کیا چاہتے ہو؟'' عدیل نے بمشکل اپنے لہجے کی لرزش کو چھپایا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''تم نے اس کو ضد بنالیا ہے جمشید خاں۔''

''چلو ضد ہی سہی۔ لیکن اس ضد میں پیسا بھی بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں گارنٹی دے سکتا ہوں۔ تھائی لینڈر اناڈا سے تمہارا صرف آٹھ راؤنڈ کا مقابلہ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں کم از کم ایک لاکھ یورو کا اضافہ کردے گا۔ ہماری کرنسی کے مطابق قریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیا۔''

''مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے جمشید خاں! تم اچھی طرح جانتے ہو میری فزیکل پوزیشن کیا ہے۔''

''لیکن مجھے یہ سب کچھ چاہیے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تمہاری فزیکل پوزیشن سے زیادہ تمہارے اندیشوں اور واہموں نے تمہارا بیڑا غرق کر رکھا ہے۔ تم سارے روزمرہ کے کام کرتے ہو، ڈرائیونگ کرتے ہو، جاگنگ کرتے ہو...... اور پتا نہیں کہ کیا کچھ کرتے ہو، لیکن باکسنگ کے رِنگ میں آتے ہوئے تمہاری جان نکلتی ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ضد میں نہیں کررہا تم کررہے ہو۔''

''دیکھو جمشید خاں، پچھلے مہینے بھی میری کمر اور اسپائنل کے ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ کہو تو میں تمہیں رپورٹس ارسال کردیتا ہوں۔''

''تمہاری وہ ساری رپورٹس شاید میں تم سے بھی پہلے دیکھ چکا ہوں۔ ان رپورٹس میں کہیں نہیں لکھا کہ تم صرف ایک مقابلے کے لیے باکسنگ رِنگ میں اترو گے تو جہان فانی سے کوچ کر جاؤ گے۔ تمہاری درمیانے درجے کی ''انجری'' کا ذکر ضرور ہے لیکن اس انجری کے لیے میں نے توانائی کا ایک زبردست انجکشن ڈھونڈ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے اندر بے پناہ طاقت اور حوصلہ محسوس کرو گے اور اصل چیز تو حوصلہ ہی ہوتا ہے۔''

عدیل جواب میں خاموش رہا۔

جمشید خاں کی تیکھی آواز دوبارہ عدیل کے کان میں گونجی۔ ''پوچھو گے نہیں، کون سا انجکشن ہے؟'' پھر خود ہی ہنس کر جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام ہے الہام...... تمہاری بیٹی کی دوری بھی تو تمہارے لیے ایک انجکشن کی طرح ہی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ انجکشن ضرور کام کرے گا اور سابقہ ایشین چیمپئن ایک بار پھر Ring میں نظر آکر اپنے چاہنے والوں کو حیران کردے گا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر اپنے لہجے کو زیادہ سنجیدہ بناتے ہوئے بولا۔ ''چیمپ عدیل! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاس پورے تین ہفتے کا ٹائم ہے۔ خود کو اچھی طرح وارم اَپ کرو...... میڈیٹیشن پر پوری توجہ دو۔ میں تمہارا اور اناڈا کا باؤٹ (مقابلہ) 3 فروری کو شیڈول کررہا ہوں۔ کراچی میں ہونے والا یہ مقابلہ بے شمار لوگوں کو حیران کردے گا۔ میں اس فائٹ کو نیٹ پر لائیو دکھانے کا انتظام بھی کررہا ہوں...... اور ہاں یاد آیا، یہ جو ایک لاکھ یورو معاوضہ میں تمہیں بتا رہا ہوں اس میں تمہاری ہار جیت کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ جیت کی شکل میں تمہیں اضافی رقم بھی مل سکتی ہے......''

''دیکھو جمشید خاں۔'' عدیل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے کچھ نہ دو، جو کچھ میرے پاس ہے وہ بھی سب لے لو...... میری الہام مجھے واپس کردو۔''

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا پُرلطف قہقہہ لگایا۔ ''تمہارے پاس کچھ بہت زیادہ تو نہیں ہے چیمپ! ایک گھر کے علاوہ کوئی پانچ چھ پلاٹ ہیں جو تم دونوں بھائیوں نے پراپرٹی کے کام کو دھکا لگانے کے لیے رکھے ہوئے ہیں لیکن اگر تمہارے پاس کچھ بہت زیادہ بھی ہوتا تو یہ مقابلے والا کام تو تمہیں پھر بھی کرنا پڑتا۔ میں ایک بار اپنے چیمپ کو ہر صورت پھر سے میدان میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن جمشید......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' اس مرتبہ جمشید خاں نے نہایت سرد لہجے میں عدیل کی بات کاٹی۔ ''تمہاری بیٹی بہت پیاری اور معصوم ہے...... اور میں چاہتا ہوں کہ یہ پیاری اور معصوم ہی رہے...... میرے خیال میں مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تین ہفتے کی مہلت، تین فروری...... اور کراچی۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

عدیل اپنی جگہ بُت بنا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی۔

☆☆☆

الہام کو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی بیسمنٹ میں ہے لیکن یہ کوئی تاریک یا حبس زدہ بیسمنٹ نہیں تھا۔ یہ نہایت جدید طریقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ آسائش کی ہر شے اس کشادہ بیسمنٹ میں موجود تھی۔ درمیانی عمر کی ایک خادمہ بھی ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنا نام انیلا بتایا تھا۔ اب پتا نہیں کہ یہ اس کا اصلی نام تھا یا نقلی۔ پہلے دو تین روز تک تو الہام نے رونے چلّانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا تھا مگر پھر انیلا کے سمجھانے بجھانے پر وہ دو چار لقمے لینے لگی تھی۔ اس تہ خانے میں اسے انیلا کے علاوہ بس ایک صورت اور نظر آئی تھی۔ دُبلے جسم لیکن لوہے کی طرح سخت اور کرخت چہرے والا ایک دراز قد شخص۔ اس نے الہام کو رونے چلّانے سے منع کیا تھا۔ پہلے پیار سے سمجھایا تھا، پھر دھمکایا تھا اور تب دوبارہ پیار کا لہجہ اختیار کیا تھا۔ اس پینتالیس پچاس سالہ شخص کا نام جمشید خاں معلوم ہوا تھا۔ اس نے الہام سے کہا تھا کہ وہ اسے انکل کہہ کر بلاسکتی ہے۔

تاہم جب الہام نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''انکل! پلیز مجھے گھر جانے دیں۔ میرے پاپا رو رو کر خود کو ختم کرلیں گے۔'' تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک بیار سا گدلاپن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''یہاں تمہاری ہر بات مانی جائے گی لیکن یہاں سے باہر نکلنے والی بات نہیں۔ تمہیں چند روز یہیں پر ٹی وی اور فلمیں وغیرہ دیکھ کر گزارا کرنا پڑے گا۔''

صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کرخت چہرے والے اس دھان پان شخص کے ساتھ ایک اور چہرہ نظر آیا تھا۔ یہ انیس بیس سالہ ایک دُبلا پتلا لڑکا تھا۔ فیشن ایبل کپڑے پہن رکھے تھے سر کے بال اسپائکس کی شکل میں تھے اور ایک کان میں گولڈن چھلا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ انکل کا کوئی قریبی...... یا شاید بیٹا ہے۔ بعدازاں انیلا کی زبانی اس کی تصدیق ہوئی تھی۔ وہ جمشید خاں کا بیٹا ہی تھا، اس کو جونی کہا جاتا تھا۔ مدقوق چہرے پر اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی لگتی تھیں۔ وہ جتنی دیر بیسمنٹ میں رہا تھا ایک قریبی کمرے میں لیپ ٹاپ کے ساتھ کچھ کرتا رہا تھا۔ الہام کو لگا تھا کہ گیم کھیلتا رہا ہے۔ اس کی موجودگی کے دوران میں انیلا، الہام کے اردگرد ہی موجود رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ جونی، الہام سے بات کرنے یا اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے گا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا۔ دُبلا پتلا کھمبے جیسا جونی جونہی بیسمنٹ میں آیا، ملازمہ انیلا کچن چھوڑ کر فوراً الہام کے پاس آگئی۔ شاید الہام کو اٹھا کر یہاں لانے والے انکل جمشید نے ہی انیلا کو اس احتیاط کے لیے کہا ہوا تھا۔ بہرحال خیریت ہی گزری۔ جونی تین چار گھنٹے بیسمنٹ میں رہا لیکن اس کی طرف سے کسی طرح کی غلط حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی منحوس شکل ایک دوسرے کمرے میں ہی گم رکھی۔ لیکن جاتے جاتے وہ ایک عجیب وغریب حرکت کر گیا۔ الہام کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ ایسا کچھ کرے گا۔ سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے اس نے بڑے اطمینان سے ایک کاغذ الہام کی گود میں پھینک دیا۔ اس وقت انیلا بھی الہام کی کرسی کے پاس قالین پر بیٹھی تھی۔ الہام حیرت سے کبھی کاغذ کو اور کبھی انیلا کو دیکھتی رہی۔

''یہ کیا ہے آنٹی؟'' الہام نے زرد ہو کر پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں، دیکھ لو۔'' انیلا نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

الہام کچھ دیر لرزتی رہی، پھر اس نے تہ شدہ کاغذ کھولا۔ جیسے کسی نے ٹھک سے اس کے سر پر لاٹھی ماردی۔ سیدھا سیدھا لکھا تھا۔ ''آئی لو یُو۔ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ سارا سارا دن تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم کہو گی کہ میں نے تو تمہیں بس ایک دو بار دیکھا ہے، اتنی جلدی یہ پیار کیسے ہو گیا؟

میں نے تمہیں ایک دو بار نہیں سیکڑوں بار دیکھا ہے اور جی بھر کر دیکھا ہے۔ اب میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ یہاں اکثر کمروں میں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں تمہارا کمرا بھی شامل ہے۔ پریشان نہ ہونا۔ یہ نہ سمجھنا کہ جمشید خاں کا بیٹا ہے۔ زور زبردستی کرے گا مگر مجھے نظرانداز بھی نہ کرنا۔ زیادہ برداشت نہیں ہے میرے اندر۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے اپنے تعلقات ٹھیک رکھو گی اور یہ لَو لیٹر پاپا تک نہیں پہنچاؤ گی لیکن اگر پہنچا بھی دو گی تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔

مرجان جونی۔''

الہام سناٹے میں رہ گئی۔ وہ یہاں فریاد کرتی تو کس سے؟ ابھی تک اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کس لیے ہوا ہے۔ وہ اس دن اسکول سے گھر آئی تھی۔ بیل دیتی رہی پھر اسے اندازہ ہوا تھا کہ شرفو بابا گھر میں نہیں ہیں اور آنٹی نوراں شاید سوگئی ہیں۔ ان کی نیند بڑی پکی تھی۔ الہام نے اسکول بیگ میں سے اپنی پرسنل چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ حسبِ اندازہ آنٹی سوئی پڑی تھیں۔ وہ انہیں جگائے بغیر چینج روم میں چلی گئی تاکہ یونیفارم بدل سکے۔ یہی وقت تھا جب ڈوربیل ہوئی۔ وہ بھاگ کر گئی۔ دوسری طرف کوئی عورت تھی جو التجا آمیز لہجے میں اس سے دروازہ کھولنے کا کہہ رہی تھی۔ الہام نے گیٹ کے ''پیپ ہول'' میں سے جھانکا اور چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ عورت اندر آئی لیکن اس کے ساتھ ہی دو ہٹے کٹے بندے بھی اندر آگئے تھے، وہ یقیناً اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ الہام کچھ سمجھ پاتی، ایک بندے نے اسے دبوچ کر اس کے منہ پر اپنا چوڑا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک تیز تیکھی بُو اس کی ناک میں گھستی چلی گئی۔ آخری لمحوں میں اسے بس یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ تڑپی، مچلی ہے اور اس کا پاؤں اندرونی کیاری کے کسی گملے سے ٹکرایا ہے......

پھر اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اس آراستہ بیسمنٹ میں پایا۔

اس نے تمتمائے ہوئے مدقوق چہرے والے انکل سے کئی بار پوچھا تھا کہ وہ اس کے پاپا سے کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ بتایا نہیں تھا، تاہم الہام کا خیال یہی تھا کہ اسے پاپا سے کوئی لمبی رقم لینے کی خاطر اغوا کیا گیا ہے۔ اسے اپنی فکر تو تھی ہی اس کو... ہر گھڑی اپنے پاپا کی فکر بھی لگی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حال میں تھے۔ اس کی واپسی کے

لیے کیا، کیا جتن کر رہے تھے۔ خیالات کے ہجوم کے سبب وہ اکثر بیٹھے بیٹھے رونے لگتی تھی۔ ایک دن پہلے تک وہ اسی اسکول یونیفارم میں تھی جو واقعے کے روز پہن رکھی تھی، لیکن کل دوپہر انیلا نے اصرار کر کے اس کے کپڑے بدلوائے تھے اور اس کے اُلجھے ہوئے بالوں میں کنگھی وغیرہ کی تھی۔

مذکورہ واقعے کے بعد دو دن تو طوطے جیسی ناک والا بانس نما جونی نظر نہیں آیا مگر تیسرے دن اس نے پھر اپنی شکل دکھا دی۔ وہ ایک تنگی شرٹ اور واہیات کی حد تک تنگ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ وہ الہام کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے ملازمہ انیلا سے کہا کہ وہ کافی بنا کر لائے۔ انیلا جزبز نظر آئی۔ پھر ہولے سے بولی۔ ''سوری چھوٹے مالک! بڑے مالک نے کہہ رکھا ہے کہ میں الہام کو اکیلا نہ چھوڑوں۔ یہ ڈر جاتی ہے۔''

جونی نے کھا جانے والی نظروں سے انیلا کو دیکھا۔ غصے کے ساتھ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ الہام کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ مختصر جواب دیتی رہی۔ ان کی باتیں ٹین ایجرز والی ہی تھیں۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ سوشل میڈیا استعمال کرتی ہے یا نہیں۔ ٹک ٹاک میں دلچسپی رکھتی ہے یا نہیں؟ کون کون سی گیم کھیلتی ہے۔ جلد ہی اس نے اپنے اور الہام کے درمیان ایک مشترکہ دلچسپی ڈھونڈ لی۔ یہ معروف کمپیوٹر گیم ورلڈ آف کرافٹ تھی۔ اس نے الہام کو مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ یہ گیم کھیلے۔ اس نے کہا۔ ''یہ مت سوچو کہ اس بیسمنٹ سے جلدی تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ کچھ پتا نہیں کہ تمہیں کتنی دیر یہاں رہنا پڑے۔ کوئی تفریح نہیں رکھو گی تو یہ ٹائم گزارے نہیں گزرے گا۔''

اس کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ الہام کے اردگرد رہنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ الہام کی طرف پیش قدمی کرنے کے اشارے بھی اس کی گفتگو میں واضح تھے مگر شاید اس کے باپ نے اس کے لیے کچھ حدود مقرر کر رکھی تھیں۔

اس کے بعد تقریباً روزانہ ہی جونی بیسمنٹ میں آنے لگا۔ یہاں کامن روم میں دو میزیں قریباً بارہ فٹ کے فاصلے پر موجود تھیں۔ دونوں میزوں پر ایک ایک لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ الہام کی مرضی یا موڈ کی پروا کیے بغیر جونی اسے گیم کھیلنے کا کہتا تھا۔ وہ بہ امر مجبوری کھیلنا شروع کر دیتی تھی۔ کبھی کسی وقت اسے تھوڑی بہت دلچسپی بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ البتہ جونی کی موجودگی اسے بالکل نہیں بھاتی تھی۔ خاص طور سے جب بھی اس کی حریص نگاہیں الہام کے سراپا سے ٹکراتی تھیں، وہ اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس کرتی۔ اس کے علاوہ پتا نہیں کیا بات تھی ایک طرح کی بُو سی بھی جونی کے جسم سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہ کسی نشے کی بو تھی۔ جب تک وہ بیسمنٹ میں موجود رہتا، انیلا بھی الہام کے قریب ہوتی۔ اس کی موجودگی سے الہام کی ڈھارس بندھی رہتی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کامن روم میں بھی ایک دو خفیہ کیمرے موجود ہیں۔

ایک روز جونی آیا تو ایک خوب صورت ڈبیا میں ایک بریسلیٹ لے آیا۔ ڈبیا الہام کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھو...... چار چھوٹے ڈائمنڈ لگے ہوئے ہیں اس پر۔ تمہارے لیے لایا ہوں۔''

الہام نے بے بسی سے خادمہ انیلا کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات سے الہام کو اندازہ ہوا کہ وہ انکار نہ کرنے کا کہہ رہی ہے۔ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ اس نے مجبوراً بریسلیٹ لینے کے لیے جونی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بولا۔ ''نہیں ڈیئر! خود پہناؤں گا۔''

الہام نے ایک بار پھر بے بسی کے عالم میں انیلا کی طرف دیکھا۔ تب کلائی آگے بڑھا دی۔ اس نے کہا۔ ''ڈیئر! یہ کلائی والا نہیں، بازو والا ہے۔ آستین اوپر کرو۔''

الہام جھجک رہی تھی، اس نے خود ہی اس کی آستین کندھے تک چڑھا کر بریسلیٹ اس کے بازو پر پہنا دیا۔ اس کا لمس الہام کے لیے کانٹوں بھری شاخ جیسا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی بُو... اضافی کراہت کی وجہ تھی۔

یہی وقت تھا جب زینوں پر اس کا باپ نظر آیا۔ وہ بلاتمہید بولا۔ ''جونی! یہاں کیا کر رہے ہو۔ چلو اوپر جاؤ۔ مجھے ضروری بات کرنی ہے اس سے۔'' اس کا اشارہ الہام کی طرف تھا۔

ان لمحوں میں جونی باپ کا اطاعت گزار نظر آیا۔ وہ اور انیلا اوپر چلے گئے۔ انکل جمشید نے کہا۔ ''لے بچی! تیری خواہش پوری کر رہا ہوں۔ باپ سے بات کر لے لیکن زیادہ لمبی نہیں اور دیکھ کوئی جھوٹ بھی نہیں بولنا۔''

جمشید خاں کے دبلے پتلے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا لائٹ ویٹ ''لیپ ٹاپ'' نظر آ رہا تھا۔ الہام کا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر اپنے پاپا اور چچا جمیل کو دیکھ رہی تھی۔ قریباً دس روز کے اذیت ناک انتظار کے بعد یہ ملاقات بے

حد جذباتی اور رقت آمیز تھی۔ وہ رو رہی تھی اور بات کرتے ہوئے بار، بار اپنی انگلیوں کی پوروں سے اسکرین کو چھو رہی تھی جیسے اپنے پاپا کے چہرے کو چھو رہی ہو۔

اس کے پاپا کے بال پیشانی پر منتشر تھے اور ان کی آنکھوں سے کرب جھلک رہا تھا مگر وہ حوصلے میں نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاپا کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ”پاپا! میں ٹھیک ہوں لیکن میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ ایک منٹ بھی نہیں۔ پلیز مجھے لے جائیں یہاں سے۔“

پاپا بولے۔ ”بس تھوڑا سا انتظار تمہیں اور کرنا پڑے گا الہام۔ بس چند دن۔ میں روزانہ ہی تمہیں کال کروں گا۔“

”کتنے دن کا انتظار پاپا؟“ وہ بلک اٹھی۔

اس مرتبہ چچا جمیل نے اسے پچکارا۔ ”صرف چند دن الہام...... اور یقین رکھو، یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ انکل نے ہر طرح تمہارا دھیان رکھنے کا وعدہ کیا ہے اور ہم روزانہ ہی تم سے بات بھی کر لیں گے۔“

”لیکن یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ میں نہیں رہنا چاہتی یہاں۔“ وہ کراہی۔

”ایک مجبوری ہے میری بچی۔ جیسے ہی یہ دور ہوتی ہے، یہ انکل خود تمہیں چھوڑ کر جائیں گے۔“ اس کے پاپا نے کہا۔

الہام کے پہلو میں کھڑے انکل جمشید نے تسلی بخش انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی طرف سے بھی ”حوصلہ“ دیا۔

الہام کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس اپنے پاپا کے سینے سے لگنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اپنے پاپا کا دکھ اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆

عدیل اپنی زندگی کے مشکل ترین دوراہے پر تھا۔ ایک طرف اس کی بیٹی تھی اور دوسری طرف اس کی اپنی زندگی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جمشید خاں کی ضد جان لیوا ہے۔ اگر وہ باکسنگ کے رنگ میں اترا تو صحیح سلامت باہر نہیں آ سکے گا۔ جان بچ بھی گئی تو اسے جسمانی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔

کمر کی یہ چوٹ کوئی معمولی چوٹ نہیں تھی۔ اس کے درمیانی مہرے بُری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ پچھلے پانچ چھ برس میں اس نے اپنے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ جمیل بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہا تھا۔ بلکہ ایک موقع پر تو جمیل نے اپنا ایک قیمتی ذاتی پلاٹ، کم قیمت پر فروخت کر دیا تھا اور عدیل کو زبردستی امریکا لے گیا تھا۔ وہاں ایک ماہر آرتھوپیڈک معالج اور اس کی ٹیم نے عدیل کا تفصیلی معائنہ اور ٹیسٹ وغیرہ کیے تھے۔ نتیجہ وہاں بھی وہی نکلا تھا جو دیگر جگہوں پر نکلتا رہا تھا۔ عدیل کو اسپائنل سرجری کی ضرورت تھی اور یہ بہت رسک والی سرجری تھی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ اس تکلیف کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ عدیل ایک نہایت محتاط زندگی گزارے۔ ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق ادویات کا استعمال اور مجوزہ ورزشیں جاری رکھے تاکہ چلنے پھرنے کے قابل رہ سکے۔ اس صورت میں اس بات کا امکان بھی موجود تھا کہ کسی وقت بغیر آپریشن کے ہی مہروں کی اس تکلیف میں افاقہ ہو جائے۔ امید وبیم کی بس اسی کیفیت میں پچھلے چھ سات برس گزر گئے تھے۔

”سنبل! تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟“ عدیل نے مرحومہ بیوی کی تصویر کے سامنے بیٹھے بیٹھے جذب کے عالم میں کہا۔ چہرے پر اندوہ کی گہری کیفیت تھی۔

تصویر کیا جواب دیتی، وہ خاموش تھی۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”تمہاری بیٹی تمہاری تصویر ہے سنبل۔ مجھے اس میں تم نظر آتی ہو۔ اور وہ بہت بڑی مصیبت میں ہے سنبل۔ میں اس کی زندگی کے لیے بڑے سے بڑا رسک لینے کو تیار ہوں۔ تم اب نہیں ہو، اگر تم زندہ ہوتیں تو تم بھی مجھے یہ رسک لینے سے نہ روکتیں...... میں یہ رسک لینے جا رہا ہوں سنبل، میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

دروازے پر ہونے والی مدھم دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں آنے والی نمی کو پونچھا اور بولا۔ ”کون ہے؟“

نوراں کی آواز آئی۔ ”صاحب جی! تابانہ بی بی آئی ہیں۔“

عدیل چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وال کلاک پر نظر دوڑائی۔ چار بج چکے تھے۔ وہ قریباً روزانہ ہی سہ پہر کے وقت آ رہی تھی اور عدیل کی کمر کا مساج وغیرہ کرتی تھی۔ وہ ایک کوالیفائڈ فزیوتھراپسٹ تھی۔ عدیل نے اور ایس پی عرفان نے تابانہ اور اس کی والدہ کو تسلی تشفی دی تھی اور وہ پچھلے ہی ہفتے شیخوپورہ سے واپس لاہور، اپنے گھر آ گئی تھیں۔ آج کل تابانہ باقاعدگی کے ساتھ عدیل سے مل رہی تھی۔ دراصل عدیل فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ الہام کی سلامتی کی خاطر جمشید خاں کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔ اس

کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ تین چار روز پہلے اس سلسلے میں فون پر اس کی جمشید خاں سے تفصیلی گفتگو ہوئی تھی اور معاملہ طے پایا تھا۔ معاملہ طے پانے کے بعد جمشید خاں نے وڈیو لنک کے ذریعے پہلی بار الہام کی بات عدیل اور جمیل سے کرائی تھی۔ اب عدیل نے تھائی باکسر اناڈا کے ساتھ آٹھ راؤنڈ کے مقابلے کے لیے ہلکی پھلکی ٹریننگ شروع کر دی تھی۔ اس کے لیے اس نے اپنے کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ مشورہ کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ وہ اپنا دشمن آپ کیوں ہو رہا ہے۔ اسے سخت نقصان اٹھانا پڑے گا...... بلکہ سخت ترین نقصان۔

تابانہ سب کچھ جانتی تھی اسی لیے وہ بے حد فکرمند بھی تھی۔ وہ کھلاڑی ہی نہیں فزیو تھراپسٹ بھی تھی۔ جانتی تھی کہ ہلکی پھلکی ٹریننگ بھی عدیل کی کمر پر کتنا اسٹریس ڈال سکتی ہے۔ اس نے بے حد اصرار کے ساتھ عدیل کو آمادہ کیا تھا کہ ٹریننگ سیشن سے پہلے اور بعد میں وہ تھوڑی سی تھراپی کرائے۔ خصوصاً ٹریننگ کے بعد اسے تھراپی کی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ اس کی کمر کا جھکاؤ بڑھ جاتا تھا اور وہ کافی دیر تک سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا بستر پر چت لیٹنا بھی اس کے لیے قطعی ناممکن ہوتا تھا۔

''کیسے ہیں جی؟'' تابانہ نے اندر آتے ہوئے چست انداز میں کہا۔

''بس ٹھیک ہوں۔'' اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ''لیکن جم کے لیے دیر ہوگئی ہے آج مساج رہنے نہ دیں؟''

''نہیں سر! وقفہ نقصان دہ ہوگا۔'' وہ پروفیشنل انداز میں بولی۔

اس نے قمیص اتارنے میں عدیل کی مدد کی۔ پھر اپنی جرسی کی آستینیں اُڑسیں اور عدیل کو پہلو کے بل لٹا دیا۔ اولیو آئل لگا کر وہ بڑی نرمی اور مہارت کے ساتھ مساج کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس میں کچھ ایسی بات تھی جو بالکل جدا محسوس ہوتی تھی۔ عدیل کو لگتا تھا کہ اس کے رگ و پٹھوں میں آئل کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی محبت بھی سرایت کر رہی ہے۔ تابانہ کے گال شہابی ہو جاتے، اس کی سانس مشقت کے سبب ذرا سی تیز ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ تھراپی صرف عدیل کے رگ و پٹھوں کو ریلیکس کرتی تھی، اس کی کمر کی موذی تکلیف کو اس سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔

روز کی طرح وہ آج بھی تھراپی کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھی۔ ''جناب اسپورٹس کے کئی ٹی وی چینلز آپ کے مقابلے والی خبر چلا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی اس کا کافی ذکر ہے۔ لگتا ہے کہ یہ جمشید خاں اور اس کا فرنٹ مین باوا کافی پیسا اکٹھا کرلیں گے۔ بس یہ لالچ ہی تھا جس نے ان لوگوں کو اتنے بڑے جرم پر اُکسایا ہے۔ اس لالچ کے سبب ان لوگوں نے آپ کی صحت سلامتی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے تابانہ کے لہجے میں گہرا درد اتر آیا۔

''جو کچھ بھی ہے تابانہ، بس دعا کرو کہ الہام خیریت کے ساتھ گھر واپس آجائے۔''

''ان لوگوں کا کچھ بھروسا تو نہیں ہوتا سر، کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ آپ کے اتنے بڑے رسک کے باوجود یہ لوگ بعد میں پس و پیش کرنے لگیں۔''

''امید تو نہیں ہے۔'' عدیل نے ذرا کراہتے ہوئے کہا۔ ''سنا یہی ہے کہ یہ بُرے لوگ بُرے کام بڑی ایمان داری سے کرتے ہیں۔''

''خدا کرے سب ٹھیک ہو جائے۔ آپ بھی ٹھیک رہیں اور ہماری الہام بھی عافیت کے ساتھ گھر واپس آجائے۔'' تابانہ نے بڑے درد سے کہا اور عدیل کو محسوس ہوا کہ دو قطرے اس کے عریاں کندھے پر گرے ہیں۔ یہ آئل نہیں تھا، یہ آنسو تھے جو تابانہ کی گہری سیاہ آنکھوں سے ٹپکے تھے۔

وہ اسی طرح کروٹ کے بل لیٹے لیٹے بولا۔ ''تابانہ! تمہارے اپنے بھی مسئلے ہیں...... ان کی طرف توجہ دو۔ خود کو اس معاملے میں اتنا ہلکان مت کرو، مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

وہ عجیب آہنگ میں بولی۔ ''یہ سب میرے بس میں نہیں ہے سر! اس وقت میرے لیے آپ کے مسئلے سے بڑا مسئلہ کوئی نہیں ہے۔ میں...... اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

تابانہ بین السطور وہ سب کچھ کہہ رہی تھی جو اس نے اس سے پہلے اپنے عید کارڈ کے ذریعے سمجھایا تھا اور اپنے خط میں کہا تھا۔ وہ عدیل کی صرف پرستار نہیں رہی تھی، گزرے ماہ و سال نے اور پھر عدیل کی اتفاقیہ ''دید'' نے اس کی پسندیدگی کو محبت کے جذبے میں ڈھال دیا تھا۔ شاید وہی محبت جو وقت دیکھتی ہے، نہ عمر، نہ ذات پات نہ کوئی اور رکاوٹ۔ وہ بس ہو جاتی ہے اور کسی جادو کی طرح سر چڑھ کر کہتی ہے۔ ''لو...... میں ہو گئی ہوں۔ اب تم سے جو بن پڑتا ہے کرلو۔ اگر مجھ میں طاقت ہے تو میں اپنا آپ منوا کر دکھا

دوں گی۔ ساری دنیا مل کر بھی مجھے ہرا نہیں سکتی کیونکہ ہار اور جیت میرے لیے ہم معنی ہیں۔ میں جیت کر تو جیتتی ہی ہوں، ہار کر بھی جیت جاتی ہوں۔"

عدیل ایک سرد سانس لے کر رہ گیا۔ وہ تابانہ سے اپنے سابقہ رویے پر بے حد شرمندہ تھا۔ اب اس میں اتنی سکت ہرگز نہیں تھی کہ وہ کوئی سخت بات کہہ کر اسے صدمہ پہنچائے۔ یہی وقت تھا جب میز پر پڑے عدیل کے فون کی بیل ہونے لگی۔ تابانہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی میز کی طرف گئی اور فون عدیل کے ہاتھ میں تھمایا۔ اسکرین دیکھ کر عدیل نے فون ایک طرف رکھ دیا۔ یہ کراچی کے معروف آرتھوپیڈک معالج تھے۔ سرجری بھی کرتے تھے۔ عدیل کچھ عرصہ ان کے زیرِ علاج بھی رہا تھا۔ عدیل سمجھ گیا کہ فروری کی 3 تاریخ کو ہونے والے باکسنگ مقابلے کی خبر ان تک بھی پہنچی ہے اور وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے عدیل کو اس حماقت کے مضمرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک دو فون عدیل کو لاہور سے بھی آچکے تھے۔ وہ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا کہ بیٹی اس کی زندگی ہے...... اگر یہ زندگی نہیں ہے تو پھر زندگی کا کیا کرنا۔

☆☆☆

عدیل فرسٹ فروری کو ہی کراچی پہنچ گیا تھا۔ جمیل اور عرفان بھی فضائی سفر کر کے اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ کراچی میں بھی عدیل نے ہلکی پھلکی ٹریننگ اور شیڈو باکسنگ جاری رکھی تھی۔ ادویات اور مخصوص ورزشوں کے سبب وہ خود کو پہلے سے کچھ بہتر محسوس کرتا تھا۔ وارم اَپ ہونے کے بعد وہ اپنی کمر کو سیدھا کرنے کے قابل بھی ہو جاتا تھا۔ تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب عارضی ہے اور اصل صورتِ حال تو مقابلے کے وقت ہی سامنے آنی ہے۔

اور آج مقابلے کا دن 3 فروری تھا۔ ویک اینڈ کی شام آٹھ بجے منعقد ہونے والے اس مقابلے نے کافی شہرت پائی تھی۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا میں تسلسل سے خبریں لگ رہی تھیں۔ باکسنگ کے شائقین دو پرانے حریفوں عدیل اور اناڈا کو ایک بار پھر آمنے سامنے دیکھنے کے حوالے سے بے حد پُرجوش تھے۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ ان کا محبوب کھلاڑی کس عذاب سے گزر رہا ہے۔ آج کا سارا دن ہی تناؤ بھرا تھا۔ پہلے، دوپہر کے وقت مخصوص وڈیو لنک کے ذریعے الہام سے عدیل کی جذباتی ملاقات ہوئی۔ وہ بے چاری کچھ نہیں جانتی تھی کہ آج اس کا بیمار باپ اس کی سلامتی کے لیے کتنے بڑے امتحان سے گزر رہا ہے۔ عدیل نے اس پر کچھ ظاہر بھی نہیں ہونے دیا۔ تاہم الہام سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی آواز بار بار بھرّاتی رہی۔ دل میں خیال آتا رہا کہ پتا نہیں آج وہ جس آزمائش سے گزر رہا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ بے سہارا الہام ہمیشہ کے لیے اس کی صورت دیکھنے کو ترس جائے۔

الہام سے گفتگو ختم ہونے کے دو گھنٹے بعد جمشید خاں کی کال آگئی۔ وہ اپنی قدرے باریک لیکن تلوار جیسی تیز آواز میں بولا۔ "چیمپ عدیل! مقابلے میں اب بس چند گھنٹے باقی ہیں۔ میں ایک بار پھر تمھیں تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔ فکسنگ یا انڈر پرفارمنگ سے مجھے ہمیشہ سخت نفرت رہی ہے۔ مجھے نظر آنا چاہیے کہ اس مقابلے میں تم اپنی ہمت، طاقت کے مطابق اپنا سو فیصد دے رہے ہو۔ یہ آٹھ راؤنڈ کا مقابلہ ہے اور تمھاری پوری کوشش ہونی چاہیے کہ یہ چھ سات راؤنڈ تک تو ضرور چلے۔ مجھے تمھاری یہ کوشش اور کمٹ منٹ نظر آئے گی تو ہی ہمارا معاہدہ بھی برقرار رہے گا۔"

وہ بہت کمینہ اور خرانٹ شخص تھا۔ عدیل کا دل چاہا وہ اس کے سامنے ہو اور وہ تمام اندیشے اور خطرات بالائے طاق رکھ کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ اپنی اور اس کی جان ایک کر دے مگر وہ جانتا تھا اس کی زندگی، اس کا لختِ جگر اس کی بے رحم مٹھی میں ہے۔ اسے خود پر ضبط کرنا ہے۔ اس نے جمشید خاں کی بات کا جواب اس کی مرضی کے مطابق تحمل سے دیا۔

جمشید خاں ذرا توقف کے بعد بولا۔ "تم سے ایک اور خاص بات بھی کرنی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمھیں یہ بات زیادہ بُری نہیں لگے گی...... بلکہ پسند آئے گی لیکن ابھی نہیں ابھی تم اپنی پوری توجہ شام کے مقابلے پر فوکس رکھو۔ میری تو خواہش ہے کہ تم جیتو...... تھائی لینڈر کو دھول چٹاؤ اور صرف یہی مقابلہ نہیں اور مقابلے بھی جیتو۔"

"جمشید خاں! میرے لیے بہت بہتر ہوگا کہ تم اپنی یہ نیک تمنائیں اپنے پاس ہی رکھو۔" عدیل کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

جمشید خاں نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ "گھبراؤ مت۔ میرا اور تمھارا معاہدہ صرف اسی ایک مقابلے تک ہے۔ اس کے بعد تمھاری اپنی مرضی ہوگی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے "گڈ وشز" کہا اور فون بند کر دیا۔

اور یہ منظر تھا مقابلے کا۔ سیکڑوں پُرجوش تماشائیوں کے درمیان عدیل اپنے پرانے حریف اناڈا کے سامنے رِنگ میں تھا۔ اناڈا کی عمر 35 سال تھی۔ وہ عدیل سے قریباً چھ سال چھوٹا تھا۔ اس کی ''فزیک'' بھی کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ یقیناً اسے بھی معلوم تھا کہ عدیل اپنی انجری سے ''صحت یاب'' ہوکر میدان میں آیا ہے۔ انجری سے ابھر کر میدان میں آنے والوں کے لیے کامیابی کا تناسب بہت کم ہوتا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ پُراعتماد تھا۔ (اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ عدیل ابھی تک انجری کی حالت میں ہی ہے تو شاید اس کا اعتماد اور بڑھ جاتا)

مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں باکسرز نے پہلا راؤنڈ بہت سنبھل کر کھیلا اور زیادہ تر ایک دوسرے کو تولتے اور جانچتے رہے۔ دوسرے راؤنڈ میں اناڈا نے عدیل پر کچھ سخت حملے کیے اور اناڈا کے حمایتیوں اور اس پر شرط لگانے والوں نے شور بلند کیا۔ تیسرا راؤنڈ قریباً مساوی ہی رہا۔ اناڈا کی غیر معمولی خود اعتمادی میں رخنہ ڈالنے کے لیے عدیل نے بھی اس پر چند مؤثر وار کیے۔ اس لڑائی میں عدیل کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ جمشید خان کو مطمئن کرسکے اور اس کی خواہش کے مطابق مقابلے کو کھینچ تان کر چھٹے ساتویں راؤنڈ تک لے جائے۔ جہاں تک جیتنے کی بات تھی، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کی جیت بس یہی تھی کہ وہ میدان میں آگیا تھا اور مقابلہ کررہا تھا۔ چوتھے اور پانچویں راؤنڈ میں اناڈا نے عدیل کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ عدیل کی کمزوریاں جانچ کر شیر ہوگیا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے اسٹاک پنچ کا بھرپور استعمال کیا اور عدیل کو لڑکھڑا دیا۔ عدیل کے نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ اناڈا کے سپورٹرز فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ پانچویں راؤنڈ کے آخر میں عدیل نے خود کو سمیٹ کر جوابی حملے کی ادنیٰ سی کوشش کی تو اس کی کمر کے پٹھوں میں ایسا زبردست کھچاؤ پیدا ہوا کہ وہ کراہ کر رہ گیا۔ پانچواں راؤنڈ اناڈا کی نہایت واضح برتری پر ختم ہوا۔ عدیل کا چہرہ لہولہو تھا۔ اس نے دیکھا تماشائیوں کی اگلی صف میں بیٹھی تابانہ رو رہی تھی، جمیل کا چہرہ بھی دھواں دھواں تھا۔ ایک بیمار باپ اپنی ''لاڈلی'' کی سلامتی اور عافیت کے لیے ہزاروں نگاہوں کے سامنے اپنی صحت اور زندگی کو داؤ پر لگائے ہوئے تھا۔ ایک ''بےرحم'' نے اس کی حالت کی پروا کیے بغیر اسے ان گنت لوگوں کے سامنے تماشا بنا دیا تھا۔

عدیل کے بھی خواہوں کا خیال تھا کہ شاید عدیل کو ٹیکنیکل ناک آؤٹ قرار دے کر مقابلہ ختم کردیا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور چھٹا راؤنڈ عدیل کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ بپھرے ہوئے اناڈا نے اس پر مکوں کی بارش کردی۔ وہ اسے ناک آؤٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ عدیل کی ایک ابرو سے بہنے والا خون اس کی آنکھ میں جمع ہورہا تھا۔ اناڈا کا ایک طوفانی مُکا بچانے کی ناکام کوشش میں اس نے اپنا سر پیچھے ہٹایا تو اس کی مضروب کمر کو ایسا شدید دھچکا لگا کہ پورا جسم درد سے چیخ گیا۔ اُسے یوں لگا تھا کہ ایک لمحے میں اس کی ٹانگیں بے جان ہوگئی ہیں۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پشت کے بل گرا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سنبل اور الہام کے چہرے گھومے اور پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

وہ مرچکا تھا یا شاید مر رہا تھا...... یا عالمِ ارواح میں تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی منوں وزنی پلکوں کو اٹھایا۔ اسے اپنے آس پاس کہیں اپنے بھائی جمیل کی آواز سنائی دی۔ پھر یہ آواز بھی کہیں کھوگئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اسپتال کے کمرے میں ہے اور اکیلا ہے۔ وہ کروٹ پر لیٹا ہے۔ اسے وہ سب کچھ یاد آیا جو اس کے بے ہوش ہونے سے پہلے پیش آیا تھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے ماتھے کی طرف گیا۔ یہاں ایک بھاری بینڈیج تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں۔ وال کلاک دو بجے کا وقت بتا رہا تھا اور یقیناً یہ رات کے دو تھے کیونکہ اسپتال کے طول وعرض میں نیم تاریکی اور خاموشی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اور چونکا۔ جمیل بھی کمرے میں موجود تھا اور ایک صوفے پر سو رہا تھا۔ اس نے اسے پکارنا چاہا لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ اس نے اپنے جسم کو احتیاط سے حرکت دی اور خود ہی ہاتھ لمبا کرکے تپائی پر رکھا ہوا اپنا موبائل فون اٹھایا اور تب ہی اس پر ایک ایسا انکشاف ہوا جس نے اسے سرتاپا ہلا دیا۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ وہ جہاں کا تہاں ساکت رہ گیا۔ اُسے لگا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ یہ کیسے ہوگیا ہے؟

وہ تکیے کے سہارے تھوڑا سا گھوما۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ جمیل کو پکارے۔ اسے اتنی زور سے آواز دے کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے لیکن پھر فوراً ہی ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے، وہ غلط ہے۔ صرف ایک دھوکا ہے۔ نہیں ابھی اسے جمیل

کونہیں بتانا چاہیے۔ کسی کو بھی نہیں بتانا چاہیے' پہلے اُسے پوری طرح تصدیق کر لینی چاہیے۔

یہی وقت تھا جب ایک نوجوان ڈیوٹی ڈاکٹر، نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ خوش دلی سے بولا۔ ''میرا اندازہ تھا کہ آپ جاگ چکے ہیں...... لیکن جناب ابھی آپ کو بے حد، بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔'' اس نے عدیل کو کندھوں سے تھام کر بہت آہستگی سے اس کی کمر کو تکیوں سے ٹکایا اور نرس کو اشارہ کیا کہ وہ اس کا بی پی وغیرہ چیک کرے۔

غالباً بے ہوشی یا غنودگی کی حالت میں عدیل کا سی ٹی اسکین کیا جا چکا تھا اور کمر کے دو تین ایکسرے بھی اتارے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر توجہ سے ایکسریز کا معائنہ کرنے لگا۔ اسی دوران میں جمیل بھی جاگ چکا تھا۔ اس نے آنکھوں میں نمی لے کر بڑی محبت سے اس کا ہاتھ چوما۔ ڈاکٹر نے اسے کسی میڈیسن کی پرچی تھمائی اور پھر اس کے ساتھ دھیمے لہجے میں بات کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

عدیل نے مزید 48 گھنٹے اسپتال میں گزارے۔ ڈاکٹرز اُسے ہلنے جلنے سے منع کر رہے تھے بلکہ سینے میں انفیکشن کی وجہ سے زیادہ بات چیت بھی کرنے نہیں دے رہے تھے۔ لیکن وہ بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ اپنے ہمراز دوست جیسے بھائی جمیل کو وہ سب کچھ بتانا چاہتا تھا جو دو دن پہلے اس پر آشکار ہوا تھا۔ وہ لمحے جو جاگتی آنکھوں کے خواب جیسے تھے اور جن پر وہ اب تک پوری طرح یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ جمیل نہانے اور لباس وغیرہ بدلنے کے لیے گھر گیا ہوا تھا۔ بابا شرفو عارضی طور پر اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھا۔ عدیل بے چینی سے جمیل کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

اسی دوران میں وہ فون کال آ گئی جس کو شاید کل ہی آ جانا چاہیے تھا۔ یہ جمشید خاں کی کال تھی۔ عدیل نے تڑپ کر فون اٹھایا۔ ''ہیلو۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

جمشید خاں کی تیکھی، برے جیسی آواز نے اس کے کان کو چھیدا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر میں تم سے پوچھوں کہ کیا حال ہے، تو یہ رسمی بات ہو گی۔ مجھے پتا ہے تمھیں ابھی دس بارہ دن مزید بیڈ ریسٹ کرنا ہو گا، پھر آہستہ آہستہ حالات معمول پر آ جائیں گے۔''

پھر وہ ذرا توقف کے ساتھ گویا ہوا۔ آواز میں طنز تھا۔ ''شکریہ چیمپ! کہ تم نے میرا مان رکھا۔ برسوں بعد باکسنگ رِنگ میں اتر کر ہزاروں لوگوں کو انٹرٹین کیا۔ بے شک یہ اسپورٹ مین شپ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔''

''جمشید خاں! میری بچی کب واپس آ رہی ہے؟'' عدیل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر گمبھیر آواز میں کہا۔

''بہت جلد...... بالکل صحیح سلامت حالت میں...... بلکہ شاید تمھارے لیے ایک اچھی خبر بھی لا رہی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر جمشید خاں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''عدیل! مقابلے سے پہلے میں نے تم سے کچھ کہا تھا...... دراصل...... میں تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمھیں یہ بات بُری نہیں لگے گی بلکہ شاید پسند آئے گی۔ تمھاری بچی سمجھو میری بچی ہے۔ اسے یہاں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہو گی لیکن اِن تین چار ہفتوں میں یہاں حالات کچھ تبدیل ہوئے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عدیل نے ٹھٹک کر پوچھا۔

وہ بالکل سپاٹ بے لچک لہجے میں گویا ہوا۔ ''چیمپ عدیل! یہ جو نئی نسل ہے نا اس کے رویے ہماری سوچوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، تمھیں سن کر شاک تو ضرور ہو گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا بیٹا مرجان تمھاری الہام سے محبت کرنے لگا ہے...... اور یہ معاملہ یک طرفہ نہیں، وہ بھی اُسے پسند کرنے لگی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تمھارے سامنے اظہار نہ کرے یا بالکل مختلف رویّہ اپنائے لیکن سچائی یہی ہے جو میں تمھارے گوش گزار کر رہا ہوں۔ اس کا رونا بسورنا ختم ہو چکا ہے اور وہ ایک بالکل مختلف موڈ میں آ چکی ہے۔''

عدیل کے سینے میں جیسے شعلے بھڑک اٹھے۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ سمجھ گیا تھا کہ انڈر ورلڈ کا یہ بدمعاش اپنے وعدے سے پھر رہا ہے۔ وہ جو بات کہہ رہا تھا، وہ عدیل کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی الہام کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سنبل کا پرتو تھی۔ سنبل کی شرم و حیا اور پاکیزگی کی وارث تھی وہ۔ یہ بدذات کمینہ شخص اُس معصوم پر الزام لگا رہا تھا جو بات وہ کہہ رہا تھا، وہ اس عیاش کے بدبخت بیٹے کے بارے میں تو درست ہو سکتی تھی، الہام کے بارے میں نہیں۔

''جمشید خاں! اب اگر تم نے اس بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو...... میں کچھ کر بیٹھوں گا۔'' عدیل ہذیانی لہجے میں بولا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا تھا۔

''جو تم کر سکتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''لیکن میں تم سے کوئی زور زبردستی

کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں کوئی غلط بات کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں، وہ قانونی ہے اور شرع کے بھی عین مطابق ہے۔ میں تمہاری الہام کو اپنی الہام بنانا چاہتا ہوں۔ اپنے بیٹے کے نکاح میں دینا چاہتا ہوں۔ اسی میں دونوں بچوں کی خوشی ہے۔"

عدیل دانت پیس کر بولا۔ "دونوں بچوں کی نہیں تمہارے بدمعاش سپوت کی خوشی ہوگی اور تمہاری خوشی ہوگی۔ لیکن میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ شادی کے نام پر تمہارے بیٹے کے ہاتھوں اپنی بیٹی کو تاراج نہیں ہونے دوں گا۔ مرجاؤں گا یا ماردوں گا۔"

"دھیرج چیمپ دھیرج۔ زیادہ اُچھلو گے تو تمہارا بیڈ ریسٹ چند ہفتے کے بجائے مہینوں میں بدل جائے گا۔ دیکھو میں اپنے وعدے سے پھر نہیں رہا۔ یہاں میرے پاس وہ ہر طرح محفوظ رہی ہے اور میری شرط پوری ہونے کے بعد وہ تمہارے پاس اسی طرح منتقل ہو جاتی جس طرح تمہارے اکاؤنٹ میں ڈیڑھ کروڑ روپے منتقل ہوئے ہیں لیکن یہاں جو کچھ ہوا، وہ قدرت کا کھیل ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ہونا چاہتے ہیں۔ پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کو۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن اس وقت بھی وہ دونوں بیٹھے کمپیوٹر پر گیم کھیل رہے ہیں...... باقی تمہارے ذہن میں جو اندیشے ہیں، وہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ شاید تمہیں ڈر ہے کہ تمہارا داماد مستقبل کا ایک جرائم پیشہ شخص ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا چیمپ عدیل! الہام سے شادی کے بعد میں مرجان کو اس کاروبار سے بالکل علیحدہ کردوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں دونوں کو بیرونِ ملک کہیں سیٹل کر دوں۔ سڈنی میں میری کچھ صاف شفاف پراپرٹی ہے جو مجھے وراثت میں ملی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کو خاموشی سے وہاں بھیج دوں......"

جمشید خاں کھوکھلے لہجے میں جو طفل تسلیاں دے رہا تھا، وہ عدیل کے اندر کی آگ کو مزید بھڑکا رہی تھیں۔ وہ پھنکارا۔ "جمشید خاں! جو کچھ تم نے کہا، وہ میں نے کیا۔ اپنی جان پر کھیل کر کیا لیکن اب میں اپنی معصوم بیٹی کو کسی کی ہوس کا لقمہ نہیں بننے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔" اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے کہ تم کو عزت راس نہیں آرہی۔ ایک جائز کام کو ناجائز کہہ رہے ہو اور اس کے لیے غلط الفاظ استعمال کررہے ہو۔ بہرحال ایک بات اچھی طرح جان لو سمجھی جی، مرجان میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں نے آج تک اس کی کوئی خواہش رد نہیں کی۔ یہ بھی نہیں کرسکتا۔ تم مزید سوچ لو۔" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہونے کی منحوس آواز آئی اور عدیل کو لگا جیسے اس کا دل سینے کے اندر تھم گیا ہے۔

☆☆☆

الہام اسی تہ خانے میں اسی نامعلوم مقام پر تھی۔ جونی آج پھر سرِشام ہی آدھمکا تھا۔ آج وہ کمپیوٹر گیم کھیلنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا اور الہام کے لیے یہ غنیمت تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جلدی ہی اس کی جان چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں درمیانے سائز کا ایک مستطیل ڈبا نظر آرہا تھا۔ گتے کے اس ڈبے میں نہایت قیمتی بنارسی ساڑی تھی۔ وہ یہ ساڑی الہام کو دیتے ہوئے بولا۔ "تمہارے لیے لایا ہوں۔"

الہام نے کچھ فاصلے پر بیٹھی انیلا کی طرف دیکھا اور پھر ساڑی لے کر تپائی پر رکھ دی۔ اس کی یہ بے اعتنائی دیکھ کر سوکھے سڑے جونی کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آئے۔ کچھ دیر تک جیسے اندر ہی اندر کھولتا رہا پھر ذرا تحکم سے بولا۔ "چلو ڈیئر! مجھے یہ پہن کر دکھاؤ۔"

وہ خاموش کھڑی رہی تو اس نے اپنا فقرہ کچھ زیادہ تحکم سے دہرایا۔ الہام ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے ملازمہ انیلا کی طرف دیکھنے لگی۔ جونی کا پارا چڑھ گیا۔ "اس کی طرف کیا دیکھنے لگی ہو۔ جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔"

"مم...... میں نے کبھی نہیں پہنی...... مجھے باندھنی بھی نہیں آتی۔"

وہ پھنکارا۔ "تمہیں اور بھی "بہت کچھ" نہیں آتا ہوگا لیکن اب تمہیں کرنا پڑے گا۔ چلو جاؤ...... باندھ کر آؤ ساڑی۔"

الہام نے جھلاّئے ہوئے انداز میں ساڑی والا ڈبا اٹھایا اور اس کمرے میں چلی گئی جہاں کے واش روم میں وہ کپڑے بدلتی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد وہ واپس آئی۔ اس نے جیسے تیسے ساڑی باندھ ہی لی تھی۔ ساڑی کی چولی بہت زیادہ مختصر تھی۔ خود کو چھپانے کے لیے الہام نے ایک شال اوڑھ لی تھی۔ شال کی موجودگی نے جونی کو پھر بدمزہ کردیا۔ "یہ کیا بےہودگی ہے بھئی، اتارو اس بدرنگ چادر کو۔" وہ بولا۔

الہام اسی طرح شال کے کناروں کو دونوں مٹھیوں میں دبائے کھڑی رہی۔ وہ ایک خوب صورت تصویر نظر آرہی تھی۔ نوخیزی کے سارے رنگ اس کے متناسب جسم پر نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے خود شال نہیں ہٹائی تو جونی نے آگے بڑھ کر شال اس کے جسم سے علیحدہ کی اور انیلا کی طرف اُچھال دی۔ اب الہام کمرے کے بیچوں بیچ سر

جھکائے پشیمان کھڑی تھی۔ جونی کی تیز آتشیں نگاہیں اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھیں۔ ان لمحوں میں وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلا تو پھر وہ انگلیاں ٹیڑھی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

اُس نے دیکھا کہ الہام کے شفاف چکنے رخساروں پر آنسو رینگ رہے ہیں۔ وہ استخوانی ہاتھ سے اپنی طوطے جیسی ناک کھجا کر بولا۔ ''کیا ظلم کردیا ہے میں نے تم پر...... جو رونا دھونا کررہی ہو۔ کچھ دے ہی رہا ہوں تم کو...... کچھ چھین تو نہیں رہا۔''

اُس کے لہجے میں چھپی ہوئی دھمکی کو محسوس کر کے نوخیز الہام کے آنسو کچھ اور رواں ہوگئے۔ یہی وقت تھا جب اس کا باپ جمشید خاں سیڑھیاں اتر کر اندر آگیا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے ایک لمحے میں صورتِ حال نوٹ کرلی۔ بیٹے کو جھڑک کر بولا۔ ''جونی کیوں تنگ کر رہا ہے میری بچی کو، چل اوپر جا...... چل نکل یہاں سے۔ ایسے ہی منہ اٹھا کر نہ گھس آیا کر۔''

جونی نے تیکھی نظروں سے الہام کو دیکھا پھر فرمانبرداری کے انداز میں سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ جمشید خاں نے انیلا کو بھی دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا پھر پیار سے الہام کو اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور اسے سمجھانے بجھانے میں مصروف ہوگیا۔ وہ اسے باور کرا رہا تھا کہ جونی اس کی محبت میں گرفتار ہے...... وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اس کی خاطر خود کو ہر طرح سے تبدیل کرلے گا وغیرہ وغیرہ۔

الہام سنتی رہی اور روتی رہی۔ اس کا تقاضا بس ایک ہی تھا کہ وہ فی الحال اپنے پاپا کے پاس جانا چاہتی ہے۔ جمشید خاں نے اسے ٹھنڈے دل سے سوچنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے۔ الہام کے جانے کے بعد جمشید خاں جہاندیدہ ملازمہ انیلا سے گفتگو میں مصروف ہوگیا۔

''تیرا کیا خیال ہے انیلا، کیسے ڈھب پر آئے گی یہ؟''

''بڑے صاحب! لگتا ہے کہ ہمارے سمجھانے بجھانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں اس کا کوئی اپنا اس کے ساتھ بات کرے تو شاید اس کی عقل میں کچھ آجائے۔'' انیلا نے تھوڑا توقف کیا، پھر مودب آواز میں بولی۔ ''میں نے اندازہ لگایا ہے صاحب جی کہ یہ اپنی کسی ٹیچر کی بات بھی بہت زیادہ مانتی ہے...... مس تابانہ نام لیتی ہے اُس کا۔ اگر اس طرح کا کوئی بندہ، بندی اس سے بات کرے تو شاید یہ ڈھیلی پڑ جائے۔''

''ٹیچر کا کوئی رابطہ نمبر ہے اس کے پاس؟''

''ضرور ہوگا جی، میں کوشش کر کے نمبر لیتی ہوں اس سے۔''

جس وقت جمشید خاں اور انیلا میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ الہام اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ پاپا اور چچا جمیل نے کہا تھا کہ وہ وڈیو لنک پر اس سے بات کرتے رہیں گے لیکن کئی دن ہوگئے تھے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شاید انکل جمشید کی ہی مرضی نہیں تھی کہ بات ہو۔ وہ پاپا کو یاد کرتی رہی۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے کے لیے وہ واش روم چلی گئی۔ جب وہ دروازہ بند کر کے واش بیسن پر جھکی، اسے کچھ بہت مدھم آوازیں سنائی دیں۔ جیسے کئی عورتیں آپس میں بات چیت کررہی ہوں۔ کھانس رہی ہوں، ہنس رہی ہوں اور کسی وقت لڑ بھی رہی ہوں۔ یہ بھنبھناہٹ جیسی آوازیں اسے ایک دو دفعہ پہلے بھی سنائی دی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کشادہ بیسمنٹ کے کسی حصے میں اس کے اور انیلا آنٹی کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ کون ہیں یہ عورتیں۔ کبھی وہ نظر کیوں نہیں آتیں؟ کبھی انیلا نے ان کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

بلند چھت والے اس واش روم کی چھت کے پاس ایک چھوٹا سا گول ایگزاسٹ فین لگا ہوا تھا۔ بمشکل چند انچ قطر کا ہوگا۔ الہام کچھ دیر سوچتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ واش رومز میں خفیہ کیمرے بالکل نہیں ہیں۔ اس نے واش روم کے دروازے کو اندر سے لاک کیا پھر ہمت کر کے اس ''ٹیپ'' پر چڑھ گئی جو بالٹی بھرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ٹیپ کے پائپ پر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے اپنا چہرہ ایگزاسٹ فین تک پہنچا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوتھ برش تھا۔ اس برش کی مدد سے اس نے ایگزاسٹ فین کے باہر لگی ہوئی ''گرل'' کو تھوڑا سا اٹھایا۔ چند فٹ کی دوری پر اسے ایک دوسرے کمرے کی کھڑکی نظر آئی۔ کھڑکی کے شیشے میں سے اسے ایک ایسا منظر نظر آیا جس نے اسے حیرت میں ڈبو دیا۔

اسے اس کمرے میں کم و بیش چھ عورتیں نظر آئیں۔ ان میں سے تین چار کو بہ آسانی لڑکیاں کہا جاسکتا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ سب دُبلی پتلی کمزور تھیں۔ ان میں سے کچھ تو ہڈیوں کا ڈھانچا تھیں۔ ہر قسم کی جسمانی کشش سے محروم۔ اُن کے چہرے اگر بیمار نہیں تھے تو صحت مند بھی نہیں

تھے۔ کچھ لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کی صرف دُبلی پتلی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ شاید کچھ پڑھ رہی تھی۔ الہام حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں انہیں دیکھتی چلی گئی۔

☆☆☆

عدیل اب کراچی سے اپنے گھر آ چکا تھا۔ وہ تمام وقت بستر پر لیٹ کر گزارنے پر مجبور تھا۔ جمیل نے ایک وہیل چیئر کا انتظام تو کر دیا تھا مگر ابھی عدیل چیئر بھی استعمال نہیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹرز کا بھی یہی کہنا تھا کہ ابھی دو تین ہفتے تک وہ اپنی کمر پر کسی طرح کا کوئی دباؤ نہ ڈالے۔ عدیل کے صاحبِ فراش ہو جانے کی خبریں مین اسٹریم میڈیا اور سوشل میڈیا پر بھی گردش کر رہی تھیں۔ چند مخالفین ایسے بھی تھے جو عدیل کی صورتِ حال کو لالچ کا نتیجہ قرار دے رہے تھے مگر زیادہ تر شائقین کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔

جمیل چوبیس گھنٹے بھائی کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ اس نے کھانا پینا اور آرام خود پر حرام کیا ہوا تھا۔ وہ عدیل کی زبانی اس بات سے بھی آگاہ ہو چکا تھا کہ جمشید خاں طے شدہ معاہدے سے رُوگردانی کر رہا ہے اور الہام کی واپسی کے حوالے سے اپنے کسی منحوس بیٹے کو درمیان میں لے آیا ہے۔ جمیل کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے جسم سے بم باندھ کر جمشید خاں کی کچھار میں گھس جاتا اور اسے جہنم واصل کر دیتا۔

اگر کسی وقت جمیل کو کہیں آنا جانا پڑتا تو تابانہ، عدیل کے پاس پہنچ جاتی۔ وہ اس کی ادویات اور دیگر ٹریٹ منٹ کا خیال رکھ رہی تھی اور اسے کوئی کوتاہی کرنے نہیں دیتی تھی۔ ہر روز اس کا سوال یہی ہوتا تھا کہ الہام کب واپس آ رہی ہے۔ ہر روز عدیل اور جمیل اسے گول مول جواب دے دیتے تھے۔ عدیل کے لیے یہ قیامت کے شب و روز تھے۔

ایک روز تابانہ اکیلی، عدیل کے سرہانے کرسی پر بیٹھی تھی۔ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''سر! اگر میں کوئی لکھاری ہوتی تو آپ کے حوالے سے ایک زبردست کہانی لکھتی۔ آپ نے جس طرح ایک بے رحم شخص کا ستم سہا ہے اور اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کی ہے، وہ سنہری حروف میں درج ہونے کے قابل ہے...... اب خدا سے دعا ہے کہ ہمیں جلد سے جلد ہنستی مسکراتی الہام کی صورت نظر آ جائے۔''

عدیل صرف ایک طویل ''ہوں'' کر کے رہ گیا۔

وہ چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''پتا نہیں کس وقت کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ اور جمیل، الہام کے بارے میں...... کچھ...... چھپا بھی رہے ہیں۔''

عدیل جھنجلا گیا۔ ''تابانہ! اگر...... تمہیں اس طرح کی باتیں کرنا ہوتی ہیں تو نہ آیا کرو یہاں، اپنے گھر میں رہا کرو۔''

وہ جیسے ایک دم سہم کر چپ سی ہو گئی۔ اُس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے تھے اور وہ انگلیاں مروڑنے لگی۔ عدیل کو اندازہ ہوا کہ وہ جھلاہٹ میں زیادہ سخت بات کہہ گیا ہے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ ہولے سے اٹھایا اور نرمی سے تابانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''سوری تابانہ! مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دراصل تکلیف اور پریشانی نے مجھے توڑ پھوڑ ڈالا ہے۔ ایک بار پھر سوری۔''

''سوری تو مجھے کہنا چاہیے سر! اپنی الٹی سیدھی باتوں سے آپ کو مزید پریشان کرتی ہوں۔''

''حوصلہ رکھو تابانہ، دیر ہو رہی ہے لیکن اندھیر نہیں ہوگی۔ چند دن میں الہام انشاء اللہ ہمارے درمیان ہوگی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' تابانہ نے آہستہ سے عدیل کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی...... پھر اچانک نہ جانے اُسے کیا ہوا، اس نے ذرا جھک کر عدیل کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

عدیل اسی طرح لیٹا رہا۔ تابانہ کی ایسی جذباتی حرکتیں اسے اچھی تو نہیں لگتی تھیں لیکن اب وہ ان حرکتوں پر سٹپٹاتا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی کیفیت کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ بعض اوقات تو اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ یہ منہ زور کیفیت کسی لہر کی طرح اس پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔

وہ اسی طرح بستر پر لیٹا رہا۔ خیالات کی رو مختلف سمتوں میں چلتی رہی۔ قریباً 36 گھنٹے ہو چکے تھے جمشید خاں نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ شدت سے اس کی کال کا منتظر تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا دھیان چند روز پہلے کے ان ناقابلِ فراموش لمحوں کی طرف چلا گیا جو ہوش میں آنے کے بعد اسپتال کے کمرے میں اس پر وارد ہوئے تھے۔ وہ کیا لمحے تھے، وہ کیا انکشاف تھا۔ اس نے عدیل کو مبہوت کر ڈالا تھا۔ اسے لگا تھا کہ ان لمحوں میں سنبل بھی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اسے دیکھ رہی ہے۔ مسکرا رہی ہے۔ شروع میں عدیل کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنے ہمراز بھائی کو اس بھید میں شریک کرے لیکن پھر بوجوہ اس نے ارادہ بدل دیا تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ یہ بھید اپنے تک ہی رکھے تو بہتر

ہے۔

☆☆☆

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ امیدیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ کوئی دعا کام کر رہی تھی اور نہ دوا۔ الہام ابھی تک کسی نامعلوم مقام پر اس مکروہ جانور کے پنجے میں تھی جسے جمشید خاں کا نام دیا جاتا تھا۔ وہ انڈر ورلڈ کا بندہ تھا۔ جب کبھی بھی اس کے خلاف ایکشن ہوا تھا اس کے فرنٹ مین اور دست راست تو پکڑے گئے تھے مگر کوئی اس کی ہوا کو بھی نہیں چھو سکا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی جان چکے تھے کہ جمشید خاں ان مجرموں میں ہے جو لوہے کا چنا ہوتے ہیں اور جنہیں چبانے سے دانت ٹوٹنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا، ہاں ان کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کی سعی ضرور کی جا سکتی ہے۔ جمیل، عرفان اور تابانہ وغیرہ اب یہ چاہتے تھے کہ الہام کے اغوا کو اب مزید راز میں نہ رکھا جائے۔ باقاعدہ کیس درج کرایا جائے اور عدیل اعلیٰ حکام سے درخواست کرے کہ اس کی بیٹی کو بازیاب کرایا جائے۔ کھیل کے میدان میں عدیل کا ایک نام تھا۔ اعلیٰ ترین حکام میں بھی اس کے پرستار موجود تھے۔ وہ اس سنگین ترین معاملے میں اس کی خصوصی مدد کر سکتے تھے۔ لیکن عدیل اس حوالے سے ابھی تک خاموش تھا۔ وہ جانتا تھا اور باقی اہلِ خانہ بھی جانتے تھے کہ اس میں بہت بدنامی ہے...... اور بات صرف بدنامی کی نہیں تھی الہام کی جان جانے کا بھی غیر معمولی رسک تھا۔

بے شک یہ ایک دوراہا تھا اور اس نے عدیل اور جمیل کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ عدیل اور جمشید خاں کے درمیان تقریباً ہر روز ہی ٹیلی فونک گفتگو ہو رہی تھی۔ جمشید خاں اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ عدیل کی التجائیں اس پر کچھ اثر کر رہی تھیں اور نہ اُس کا غم و غصہ...... جمیل اور ایس پی عرفان اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ وہاں عرفان کا کوئی قریبی دوست تھا۔ یہ "سیاست داں دوست" رازداری کے ساتھ ان کی مدد کر سکتا تھا مگر فی الحال اس سے ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔ تابانہ بھی کئی دن سے دکھائی نہیں دی تھی۔ عدیل کے ذہن میں آ رہا تھا شاید وہ اُس دن والی جھڑکی کے سبب ڈس ہارٹ ہوئی تھی مگر یہ بات اس کے دل کو لگ نہیں رہی تھی۔ عدیل کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرائی لیے ہوئے تھا۔ وہ یوں پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی...... اس مشکل وقت میں وہ کسی وقت اس کی ڈھارس کی ضرورت محسوس کرنے لگتا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا جب اسے جمشید خاں کی ایک تہلکہ خیز کال موصول ہوئی۔ اس کال نے اسے سر تا پا ہلا دیا۔ جمشید خاں خود ہی کال کرتا تھا (اس کی خاص فون لائن پر کوئی کال بھی ریسیو نہیں ہوتی تھی) وہ بغیر تمہید کے بولا۔ "چیمپ عدیل! تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔"

اس کے بے لچک سپاٹ لہجے نے عدیل کو چونکا دیا۔ رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

جمشید بولا۔ "الہام نے یہ ضد چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر میرے گھر آئے گی...... پرسوں بروز ہفتہ یہیں میری رہائش گاہ پر جونی سے اس کے دو بول پڑھائے جا رہے ہیں۔ تین روز بعد آسٹریلیا کے لیے ان کے ٹکٹ بک ہے۔ وہ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

عدیل کو لگا اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔ "جمشید! تم جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پچھلے دو ہفتے میں تم نے ایک بار بھی الہام سے میری بات نہیں کرائی۔ نہ فون پر نہ وڈیو لنک پر۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں عدیل ڈیئر! جب یہ لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں نا، ان کی ساری محبتیں، چاہتیں بدل جاتی ہیں۔ ان کی نگاہیں اپنی اگلی منزلوں پر لگ جاتی ہیں۔ الہام جانتی ہے کہ تم اور تمہاری فیملی، جونی کے ساتھ اس کی شادی کو کبھی قبول نہیں کرو گے۔ لہٰذا وہ تم لوگوں سے کنی کترا رہی ہے۔ میں نے کوئی دس دفعہ اس سے کہا ہے کہ اپنے پاپا جانی سے ہی بات کر لو لیکن وہ ٹال جاتی ہے۔"

"اتنا جھوٹ مت بولو جمشید جو تمہیں خود بھی ہضم نہ ہو سکے۔ خدا کے قہر سے ڈرو۔ تم اپنے اوباش بیٹے کی خاطر ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اسے زبردستی اپنے لاڈلے کی ہوس کا کھلونا بنا رہے ہو۔ میں نے اپنی بیٹی کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ مفلوج ہو کر بستر پر آن پڑا۔ میں نے سنا تھا کہ بدمعاشوں، ڈاکوؤں اور گینگسٹروں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں ان کے اندر ضمیر موجود ہوتا ہے۔ تم اُن سے بھی گئے گزرے ہو۔"

"تم گلاس کو آدھا خالی کیوں دیکھ رہے ہو ضدی چیمپ! آدھا بھرا ہوا کیوں نہیں دیکھتے۔ مجھے بدمعاش اور گینگسٹر تو کہہ رہے ہو مگر یہ نہیں سوچ رہے کہ تمہاری بیٹی ڈیڑھ ماہ سے اس گینگسٹر کے قبضے میں ہے اور بالکل محفوظ ہے۔ میں اپنے بیٹے سے اس کا نکاح کر رہا ہوں۔ اسے بیوی بنا رہا ہوں اس کی...... اور تمہیں باقاعدہ ہر بات سے

باخبر بھی رکھ رہا ہوں۔''

''تمہاری دیانت داری اور راست بازی کا یہ پیمانہ شرمناک ہے جمشید خاں، میری بیٹی تاراج ہورہی ہے۔ تمہارے ہاتھوں نہیں ہورہی تو تمہارے بیٹے کے ہاتھوں ہورہی ہے...... اور تم اسے شادی کا نام دے رہے ہو؟''

وہ زہریلے انداز میں بولا۔ ''اب تم جو بھی کہو چیمپ عدیل! اگر جو ہونا ہے وہ تو اب ہونا ہی ہے۔ بس کر قبول کرلو یار دگر۔ مجھے بس تمہیں اطلاع دینا تھی، دے دی ہے۔'' وہ شاید فون بند کرنے جارہا تھا۔

عدیل بے طرح تڑپ اٹھا پکار کر بولا۔ ''فون بند نہ کرنا جمشید خاں! میری بات سنو...... ایک منٹ میری بات سنو۔''

''کہو...... میں سن رہا ہوں۔'' وہ جیسے اس پر احسان کرتے ہوئے بولا۔

عدیل کئی سیکنڈ تک خاموش رہا۔ وہ اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جمشید خاں بھی سکون سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر عدیل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''جمشید خاں! میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں پر یقین کرلوں۔ مجھے پتا ہے کہ تم ہرصورت الہام کو اپنے بیٹے کے نکاح میں دینے کا تہیہ کرچکے ہو۔ اس کے لیے الہام کی رضامندی یا انکار کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نہ ہی اُس کی کم عمری کا تمہیں کوئی خیال ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کا رونا دھونا بھی تم باپ بیٹے کے لیے بے معنی ہوگا...... لیکن ذرا سوچو جس ''تعلق'' کا آغاز ہی اس طرح کے جبر سے ہوگا وہ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو کیا خوشی دے گا...... اور اس میں کیا پائیداری ہوگی؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو سمبندھی جی؟'' وہ اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں بولا۔

''عدیل نے ایک طویل سانس لی...... وہ سانس ایک سرد آہ جیسی تھی۔ ''جمشید خاں! میں چاہتا ہو کہ میری الہام پر ہونے والا یہ ظلم سراسر ظلم نہ رہے اور کچھ نہیں تو اس کی شدت ہی کم ہوجائے۔ تمہارا بیٹا اگر الہام سے نکاح کر ہی رہا ہے تو پھر اسے ایک جیتی جاگتی لڑکی ملے۔ ایک بے جان، بے روح مٹی کی مورتی نہ ملے، جو اسے کوئی خوشی دے سکے اور نہ خود اپنے دکھوں کے گھیرے سے نکل سکے۔''

''کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جمشید اس کی بات دھیان سے سن رہا تھا۔

''تم نے میری کوئی بات نہیں مانی لیکن ایک بات مان لو...... اور میرا خیال ہے کہ یہ بات تمہارے اور تمہارے بیٹے کے فائدے میں ہی جائے گی۔''

''کہو سمبندھی جی۔''

وہ بھرّائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ ''ایک بار الہام سے میری ملاقات کرا دو...... ایک تفصیلی ملاقات...... وہ میری بات ٹالتی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ سمجھ جائے گی۔ پوری طرح نہ بھی سمجھے گی تو کم ازکم اس کے دکھ کی اور گریز کی شدت کم ہوجائے گی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ اپنی اس نئی زندگی سے سمجھوتا بھی کرلے۔ پاکستان سے باہر جانے کے بعد اس کی سوچوں میں مزید تبدیلی آجائے۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ ''تمہارا مطلب ہے وڈیولنک کے ذریعے......؟''

''نہیں جمشید خاں!'' عدیل نے اس کی بات قطع کی۔ ''جس طرح کی بات چیت میں اس سے کرنا چاہتا ہوں وہ اس سے مل کر ہی کی جاسکتی ہے۔ اسے پاس بٹھا کر، اس کے آنسو پونچھ کر۔''

جمشید خاں نے پینترا بدلا۔ ''دیکھو چیمپ عدیل! میں نہیں سمجھتا کہ الہام کو تم سے ملنے اور تم سے کچھ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے...... لیکن...... فرضِ محال...... میں تمہیں اس سے ملانا چاہوں بھی تو یہ کیسے ممکن ہے؟''

''تمہارے لیے سب کچھ ممکن ہے جمشید...... جو شخص قانون کی ناک کے عین نیچے سب کچھ کرتا ہے اور ہمیشہ محفوظ رہتا ہے...... وہ کیا نہیں کرسکتا...... تم کہیں کسی بھی جگہ ایک دو گھنٹے کے لیے الہام سے میری ملاقات کرادو۔ میں اس سارے معاملے کو اللہ کی رضا سمجھ کر اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کروں گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سمجھے گی۔''

دوسری طرف انڈر ورلڈ کا وہ بدمعاش کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ تب اس نے کہا۔ ''میں اس بارے میں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین گھنٹے تک میں تمہیں دوبارہ فون کروں۔''

''میری اس التجا کو ٹھکرانا مت جمشید خاں۔ اس ملاقات کا نتیجہ تمہارے لیے اچھا ہی نکلے گا۔'' عدیل نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' جمشید نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

...... اگلے ڈھائی تین گھنٹے عدیل کے لیے ایک

عذاب سے کم نہیں تھے۔ وہ جس بستر پر لیٹا ہوا تھا وہ اس کے لیے کانٹوں کا بستر بنا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ بار بار دیوار پر آویزاں تصویر کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے ساتھ سنبل بھی تڑپ رہی ہے۔ اپنی بیٹی پر ٹوٹنے والی آفت اُسے بھی خون کے آنسو رُلا رہی ہے، وہ بہ زبانِ خاموشی اس سے پوچھ رہی ہے۔ ''عدیل! یہ ہماری خوش رنگ چڑیا جیسی الہام کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ کن خونخوار عقابوں کے چنگل میں چلی گئی ہے؟ کیا تم میری الہام کو بچانے کے لیے کچھ نہ کرسکو گے...... کچھ بھی نہیں؟''

وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کی کراہ سن کر بابا شرفو جلدی سے اندر آگیا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اب بھی عدیل کی آواز پر لپک کر آتا تھا۔ ''عدیل بیٹا! کچھ کہنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بابا...... بس دروازہ بند کردو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

اس کی نگاہ بار بار اپنے سیل فون کی طرف اٹھ رہی تھی۔ فون خاموش تھا۔ اگر وہ خاموش ہی رہتا...... اس پر جمشید خاں کی کال نہ آتی، رات گزر جاتی...... کل کا دن بھی گزر جاتا...... تو کیا ہوتا...... وہ شاید کبھی الہام کی شکل نہ دیکھ سکتا۔ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ چلایا...... اور ایک کارڈ سائز تصویر نکال لی۔ یہ پانچ چھ سالہ الہام کی تصویر تھی۔ وہ عدیل کی نقل میں چھوٹے چھوٹے باکسنگ گلوز پہنے ہوئے بڑی شان سے اس کے سینے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ عدیل چت لیٹا تھا اور کچھ فاصلے پر سنبل کھڑی دونوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ عدیل نے بار بار الہام کی تصویر کو چوما اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اسے یاد تھا جب ایکسیڈنٹ کے بعد سنبل دم توڑ رہی تھی، وہ کسی شدید کرب میں نظر نہیں آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی نے جو کچھ اسے دیا ہے، وہ اس پر راضی ہے اور اب اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے اسے کچھ زیادہ خوف محسوس نہیں ہو رہا۔ اس کی بے نور ہوتی آنکھوں میں سے بس ایک التجا جھانک رہی تھی۔ وہ بہ زبانِ خاموشی عدیل سے کہہ رہی تھی۔ میری اور اپنی الہام کو سینے سے لگا کر رکھنا۔ اسے کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دینا...... اور آج...... وہ خوش رنگ چڑیا...... وہ معصوم روح، بے رحم لوگوں کے حصار میں تھی۔ تکلیف کی انتہا کو چھو رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ منتظر عدیل، اُچھل کر رہ گیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ یہ جمشید خاں ہی کی کال تھی۔ وہ بلا تمہید گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میں الہام سے تمہاری ملاقات کرانے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ملاقات دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوگی اور میری شرائط کے مطابق ہوگی۔''

''مم...... مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے جمشید خاں۔'' عدیل نے جلدی سے کہا۔

''یہ ملاقات آج ہی رات ہوگی۔ اس کے لیے تمہیں میرے پاس آنا پڑے گا اور تم جس طرح آؤ گے، اس کی تفصیل میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔''

''میں سن رہا ہوں جمشید خاں۔''

''تمہارے اردگرد کوئی اور تو موجود نہیں ہے؟''

''نہیں جمشید خاں، میں کمرے میں اکیلا ہوں۔''

''کسی بھی مرحلے پر مجھ سے جھوٹ نہ بولنا عدیل...... ورنہ بہت بُرا ہو جائے گا۔'' اس کا لہجہ بھیانک تھا۔

''نہیں بولوں گا جمشید خاں! مجھے بیٹی کی سلامتی عزیز ہے۔''

وہ عدیل کو بتانے میں مصروف ہو گیا کہ وہ کیسے اور کس طرح الہام کے پاس پہنچے گا۔

☆☆☆

عدیل نے جمیل کو ساری صورتِ حال بتا دی تھی۔ رات ٹھیک نو بجے جمشید کے لوگ عدیل کو لینے پہنچ گئے۔ یہ جمشید کا فرنٹ مین باوا اور اس کے دو ساتھی تھے۔ وہ اندر چلے آئے۔ عدیل کو بڑی احتیاط سے بستر پر سے اٹھایا گیا اور وہیل چیئر پر بٹھا دیا گیا۔ جمیل بھی ساتھ جانے کے لیے تیار تھا لیکن عین موقع پر اسے ظہور باوا نے روک دیا۔

''نہیں عدیل صاحب! آپ اکیلے جائیں گے۔''

''لیکن فون پر سب کچھ طے ہوا ہے جمشید خاں سے۔''

''نہیں، یہ نیا حکم ہے۔'' باوا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کو وائس میسج سنا دیتا ہوں۔''

اس نے اپنے موبائل پر جمشید خاں کا وائس میسج سنایا جس میں اس نے دوٹوک انداز میں عدیل کو بتایا کہ پلان میں تھوڑی تبدیلی آئی ہے۔ وہ کسی اور کو اپنے ساتھ نہیں لا سکے گا۔''

جمیل، باوا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''لیکن میرا جانا ضروری ہے۔ بھائی جان کو ہر لمحے میری ضرورت ہوتی ہے۔ پین کی صورت میں انہیں کب کون سی دوا دینا ہے، مجھے ہی پتا ہے پھر پیشاب وغیرہ کی حاجت کی صورت میں بھی......''

''پلیز چھوٹے بھائی۔'' باوا نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ بحث آپ لوگوں کو راس نہیں آئے گی۔ جمشید خاں صاحب کسی بھی وقت اپنا ارادہ بدل سکتے ہیں جہاں تک دوا اور دوسری ضرورتوں کا تعلق ہے...... ہم ہیں نا ان کے پاس اور یہ کوئی دو چار دن کے لیے تو نہیں جا رہے،

دو تین گھنٹوں کی بات ہے۔''

''ادویات کی وجہ سے یہ زیادہ پانی پی رہے ہیں اور یورین بھی زیادہ پاس کر رہے ہیں اس لیے......''

''ایسی بات ہے تو پیمپر استعمال کر لیں۔'' باوا نے تلخ طنزیہ لہجے میں بات کاٹ کر کہا۔

جمیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید وہ بھی کچھ تلخ بولتا مگر عدیل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ باوا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ لوگ کہتے ہیں۔ میں تیار ہوں۔''

باوا زیر لب مسکرایا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے گول چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ جیسے خاموشی کی زبان میں عدیل سے کہہ رہا ہو...... اگر یہ انڈر اسٹینڈنگ شروع میں دکھائی ہوتی اور باس کے کہنے پر ایک دفعہ باکسنگ Ring پر اتر آئے ہوتے تو یہ نوبت تو نہ آتی۔

باوا کے ساتھ آنے والوں کی احتیاط دیدنی تھی۔ انہوں نے نہ صرف عدیل کی مکمل تلاشی لی بلکہ وہیل چیئر کے بھی ایک ایک انچ کو پرکھ ڈالا۔ پھر عدیل کو ہدایت کی کہ وہ اپنا موبائل فون اور گھڑی وغیرہ اتار کر اہلِ خانہ کے حوالے کر دے۔ عدیل نے سن رکھا تھا کہ جشید خاں ایک نہایت ہی محتاط شخص کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک ''سروائیو'' کر رہا ہے۔ آج یہ سنی ہوئی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ جشید خاں کے بے حد محتاط ہونے کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی تھی کہ ایک ''ڈان'' ہونے کے باوجود وہ جسمانی طور پر کوئی بہت مضبوط یا زور آور بندہ نہیں تھا۔ اس کی ساری طاقت اس کی دماغی مضبوطی اور اُس کی شیطانیت میں تھی۔ اس کے حصے کی ساری مار دھاڑ اس کے خونخوار گماشتے ہی کرتے تھے۔ وہ خود شاید ہی کبھی اپنے کسی عدو کے مقابل آیا ہو۔

تلاشی کے بعد وہ لوگ اس کی وہیل چیئر کو دھکیل کر باہر لان میں لائے۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ جمیل نے دکھی انداز میں ایک شال عدیل پر ڈال دی۔ پورچ میں تنفذ شیشوں والی ایک نیلی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ عدیل کو چیئر سمیت دھکیل کر وین میں سوار کرا دیا گیا۔ باوا اور اس کا ایک ساتھی عدیل کے ساتھ پچھلے حصے میں بیٹھے اور وین روانہ ہو گئی۔ لاہور کی دو تین معروف سڑکوں سے گزرنے کے بعد وین نسبتاً کشادہ علاقے میں آ گئی۔ عدیل کو قطعی معلوم نہیں تھا کہ اسے کتنا سفر کرنا ہے اور کتنی دیر اس وین میں رہنا ہے۔

''سوری عدیل صاحب۔'' باوا نے کہا اور بڑی ملائمت سے ایک سیاہ پٹی عدیل کی آنکھوں پر باندھ دی۔

بند آنکھوں کے ساتھ عدیل نے کم و بیش آدھ گھنٹے کا مزید سفر کیا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مضافاتی علاقے میں ہے۔ اس کے ساتھی ہم سفر یکسر خاموش تھے۔ ہموار سڑک کے بعد دو تین منٹ کا ہچکولے دار سفر ہوا۔ عدیل نے کراہنا شروع کیا تو باوا کی ہدایت پر ڈرائیور نے وین کی رفتار کچھ کم کر دی۔ پھر وین ایک جگہ رک گئی۔ یہاں بالکل سناٹا تھا۔ وین کے دروازے کھلے اور بند ہوئے پھر باوا نے عدیل کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ اپنی اسپورٹ جیکٹ اور نیم گنجے سر کے ساتھ وہ کوئی کوچ قسم کی شے ہی نظر آتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''عدیل صاحب! آپ کی آنکھوں سے پٹی اس لیے ہٹائی ہے کہ آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ آپ کو تھوڑی دیر یہاں اکیلے رہنا ہوگا پھر دوسرے ساتھی آئیں گے اور آپ کو جشید صاحب تک لے جائیں گے۔''

''کتنی دیر لگے گی؟''

''میں منٹ اور سیکنڈ تو نہیں بتا سکتا جناب عالی لیکن بس تھوڑی دیر۔ آپ بالکل تسلی سے بیٹھیں۔''

اس نے کہا اور وین سے اتر کر دروازہ لاک کر دیا۔ اس کے بعد وہ درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھی بھی جا چکے تھے۔

وین میں اب تاریکی تھی۔ عدیل نے سر گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کی لگاہیں اب تاریکی میں تھوڑا تھوڑا کام کرنے لگی تھیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی باغ نما جگہ پر ہے۔ یہاں کثرت سے درخت تھے۔ سناٹے میں آوارہ کتوں کی دور افتادہ آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

وقت کی رفتار جیسے دھیمی پڑ گئی۔ عدیل وہیل چیئر پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ جشید خاں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اپنے ''مجرمانہ کیریئر'' میں ایک دو واقعات کے سوا وہ ہمیشہ پولیس کی گرفت سے محفوظ رہا ہے۔ اس خبیث کی یہ احتیاط ہر قدم پر واضح ہو رہی تھی۔ باوا اس کا صرف فرنٹ مین تھا۔ یقیناً وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آج کل جشید کا ٹھکانا کہاں ہے۔ باس کے حکم کے مطابق وہ اور اس کے ساتھی عدیل کو ایک سنسان باغ میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب کسی خاص الخاص شخص یا اشخاص نے آنا تھا اور عدیل کو یہاں سے پک کر کے جشید خاں تک لے جانا تھا۔ عدیل کو کچھ علم نہیں تھا کہ وہ لاہور سے کتنی دور اور کس رخ پر ہے...... اور آئندہ اسے کس سمت جانا ہے۔ اُس کی دھڑکنیں بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا، سوچ رہا تھا کہ الہام کا سامنا کیسے کرے گا۔ اس سے کس طرح بات

کرے گا اور کیا بات کرے گا۔

عدیل کو انتظار تو کرنا پڑا مگر بہت طویل نہیں۔ بیس پچیس منٹ بعد اسے اندازہ ہوا کہ وین سے باہر نیم تاریکی میں سائے موجود ہیں۔ پھر چابی کے ذریعے وین کا سلائڈنگ ڈور کھولا گیا اور دو افراد اندر آگئے۔ ان دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے اور مفلر وغیرہ لپیٹے ہوئے تھے۔ لباس شلوار اور جیکٹ پر مشتمل تھا۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے عدیل کی وہیل چیئر کو دھکیل کر وین سے اتارا اور کچی زمین پر چلا کر پچاس ساٹھ قدم آگے جامن اور بیری کے گھنے درختوں کے نیچے لے آئے۔ "کہاں لے جارہے ہو؟" عدیل نے سردی سے کپکپاتے ہوئے پوچھا۔

"وہیں جہاں آپ کو جانا ہے۔ باس کے پاس۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ دیہاتی ٹائپ کے لباس کے باوجود اس کا لہجہ پڑھے لکھوں جیسا تھا۔

اُن کے ہیلمٹ دیکھ کر عدیل نے سوچا تھا کہ شاید وہ موٹر بائیکس وغیرہ پر آئے ہیں مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس کا دوسرا قیافہ بھی غلط ثابت ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اسے کسی اور لگژری گاڑی میں بٹھایا جائے گا۔ لگژری گاڑی کے بجائے یہاں ایک پرانا لوڈر کھڑا تھا جس کے ڈبے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ شاید یہ پھل اور فصل وغیرہ کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

دونوں تنومند افراد نے عدیل کی وہیل چیئر کو اٹھا کر لوڈر کے پچھلے حصے میں رکھ دیا۔ لوڈر کے اوپر ترپال تنی ہوئی تھی۔ عدیل کی آنکھوں پر ایک بار پھر پٹی باندھی گئی۔ مستزاد یہ کہ اس مرتبہ اس کے کانوں میں بھی ائر ڈاٹ ٹھونس دیے گئے۔ چند لمحے بعد لوڈر باغ کے اندر سے نکل کر نامعلوم سمت کو روانہ ہوگیا۔ عدیل اب قطعی طور پر صم بکم تھا۔ بس اسے صرف اتنا پتا چل رہا تھا کہ وہ ایک ہموار سڑک پر تیزی سے سفر کر رہا ہے۔ سردی بہت تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد پھر سفر میں بریک آیا۔ منزل کے خیال سے عدیل کی دھڑکن تیز ہوگئی مگر یہ منزل نہیں تھی۔ اسے چیئر سمیت لوڈر سے اتار کر پھر ایک گاڑی پر سوار کیا گیا۔ عدیل کو محسوس بھی ہوا کہ یہ ایک ائرکنڈیشنڈ اسٹیشن ویگن یا لگژری جیپ ہے۔

اس مرتبہ سفر زیادہ تیز رفتار تھا۔ دس پندرہ منٹ تک یہ سفر بہت ہموار بھی رہا لیکن پھر یوں لگا کہ سڑک اب زیادہ اچھی نہیں ہے۔ آخر گاڑی رک گئی۔ دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اسے وہیل چیئر سمیت لگژری گاڑی میں سے احتیاط کے ساتھ نیچے اتارا گیا۔ کسی نے عدیل کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی اور کانوں سے ڈاٹ بھی نکال دیے۔ اس نے چندھیائی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ وہ اونچے ستونوں والے ایک پورچ میں تھا۔ گراسی لان کے آگے ایک بلند چار دیواری نظر آرہی تھی۔ اسے یہاں لانے والی گاڑی نہیں او جھل ہو چکی تھی۔ دو گارڈ نما افراد نے عدیل کی چیئر کو دھکیلا اور عمارت کے اندر لے آئے۔ یہاں عدیل کو ہیٹرز کی حرارت کا احساس ہوا۔ عمارت کی چھتیں اونچی اور دروازے محرابی تھے۔ بھاری پردے، قالین، فرنیچر اور آسائش کی دیگر اشیا دکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم یہ بھی پتا چلتا تھا کہ عمارت بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ عدیل کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مختصر لباس والی ایک ماڈل نما لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے دانتوں کی نمائش کر کے عدیل کو خوش آمدید کہا اور اس کی کسی بھی ضرورت کا پوچھا۔ عدیل نے نفی میں جواب دیا۔ لڑکی ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہی تھی تاہم اس کے خدوخال "ملائی" طرز کے تھے۔ "کیا وقت ہوا ہوگا؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔

اس نے موبائل دیکھتے ہوئے کہا۔ "گیارہ بج کر چالیس منٹ جناب۔"

"جمشید صاحب کب آئیں گے؟"

"آپ کو بس تھوڑے سے انتظار کی زحمت ہوگی۔ آئی تھنک اونلی اے فیو منٹس۔" قریباً دس منٹ بعد اسے یہاں لانے والے دونوں مسلح گارڈز پھر نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک بار پھر بڑی احتیاط اور باریک بینی سے عدیل کی تلاشی لی اور وہیل چیئر کو جانچا...... تب ایک گارڈ عدیل کی چیئر کو آہستہ روی سے دھکیلتا ہوا ایک قالین پوش راہداری میں لے آیا۔ عدیل کے جسم میں سنسناہٹ دوڑنے لگی تھی، اسے ایک بجے سجائے کشادہ کمرے میں پہنچایا گیا اور اس کی چیئر کو بڑے بڑے اٹالین صوفوں کے سامنے روک دیا گیا۔

"آپ صوفے پر بیٹھنا پسند کریں گے یا چیئر پر رہیں گے؟" گارڈ نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"نہیں، میں یہاں ٹھیک ہوں۔" عدیل نے کہا۔

گارڈ چلا گیا۔ کمرے میں بس وال کلاک کی مدھم ٹک ٹک تھی۔ پھر بلند دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور درمیانی عمر کا ایک دبلا پتلا دراز قد شخص بڑی شان سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ٹیکی کلر شرٹ اور کاٹرائے کی سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے ہموار بال پیچھے

کی طرف مڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے پیشانی اور بھی اونچی اور ناک مزید تیکھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی دُبلی پتلی گردن میں گولڈ کی چین تھی۔ دائیں بائیں دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ دونوں کے لباس نہایت مختصر تھے۔ ان میں سے ایک وہی ملائی نقوش والی تھی جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کامن روم میں اس کا استقبال کیا تھا۔

''واؤ...... ویلکم سمبندھی جی...... جی آیاں نوں۔'' وہ اپنی نشیلی آنکھوں میں مسکراہٹ سجا کر بولا اور آگے بڑھ کر عدیل سے ہاتھ ملایا۔

عدیل نے خود پر بمشکل ضبط کر رکھا تھا۔ وہ جمشید کی طرف زیادہ دیکھ بھی نہیں رہا تھا کہ مبادا اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی نفرت کھل کر جمشید کے سامنے آجائے۔

وہ بولا۔ ''تمہارے سفر میں تھوڑا سا کچا راستہ بھی تھا۔ تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''یہ تکلیف اُس تکلیف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، جو مجھے میری بیٹی کے حوالے سے پہنچ رہی ہے۔'' عدیل نے جیسے کراہ کر جواب دیا۔

''تم اپنے ذہن پر ضرورت سے زیادہ بوجھ لے رہے ہو چیمپ! یہ دیکھو، یہ میں نے کیا پلاننگ کی ہے دونوں بچوں کے لیے۔ دونوں ایک بہترین جگہ پر بہترین وقت گزارنے جا رہے ہیں۔'' اس نے قریبی دراز سے دو سبز پاسپورٹ اور فضائی ٹکٹ نکال کر عدیل کے سامنے رکھ دیے۔ ''نکاح کے فوراً بعد وہ دونوں سڈنی جا رہے ہیں۔''

''کہاں ہے الہام؟'' عدیل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اس سے ملاتا ہوں یار، پہلے اپنے ہونے والے داماد سے تو مل لو۔'' جمشید خاں نے کہا اور مختصر لباس والی لڑکیوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ وہ پنجوں کے بل گھوم کر باہر چلی گئی۔

ایک منٹ بعد ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ وہ بانس کا بانس تھا۔ قیمتی کپڑے جیسے اس کے جسم پر نہیں تھے کسی کھونٹی پر جھول رہے تھے۔ باپ کی طرح اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نشہ سا تیر رہا تھا۔ اب پتا نہیں کہ یہ کسی نشہ آور چیز کا نشہ تھا یا یہ پیدائشی کیفیت تھی۔ اس کی طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک کا بانسا روم لائٹ میں چمک رہا تھا۔

''سلام انکل۔'' اس کی باریک، تلوار کی دھار جیسی آواز نے عدیل کے کانوں کو مجروح کیا۔

عدیل نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ وہ بڑے کمینے سے انداز میں عدیل کے سامنے جھک گیا تاکہ اپنے سر پر پیار لے سکے۔ مجبوراً عدیل نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور اسے پیار دیا۔ وہ ادب و احترام کا جھوٹا مظاہرہ کرتا ہوا نظریں جھکا کر عدیل کے سامنے بیٹھ گیا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مرجان عرف جونی، عدیل کو بتانے لگا کہ وہ سڈنی میں ایک مختلف پلاننگ لے کر جا رہا ہے۔ وہ وہاں ایک قانونی، شریفانہ بزنس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جونی کی یہ باتیں بالکل بے حقیقت اور بے وقعت تھیں۔ عدیل جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے باپ نے ہی اسے پڑھایا ہوگا۔ ورنہ جو کچھ یہ تھا اس کی کچھ کچھ حقیقت عدیل کو بھی معلوم تھی۔ اپنے ڈان باپ کی طرح یہ لڑکا بھی شاید پیدائشی زانی اور بدمعاش تھا۔ چند ماہ پہلے ایس پی عرفان نے اسے ایک خفیہ کیس کی فائل دکھائی تھی۔ اس کے مطابق چند سال پہلے جمشید خاں کے اس سپوت نے ایک اسکول گرل کو اغوا کیا تھا اور دو ہفتے سے زائد اپنے پاس رکھا تھا۔ چونکہ وہ لڑکی ایک صوبائی منسٹر کی تھی لہٰذا میڈیا وغیرہ کو اس معاملے کی ہوا نہیں لگنے دی گئی۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے رازداری کے ساتھ معاملے کو ہینڈل کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہے تھے۔

پندرہ بیس دن بعد وہ بچی چادر میں لپٹی لپٹائی خود ہی اپنے گھر پہنچی تھی۔ اس کے پورے جسم پر تشدد کے نشانات تھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق اغوا سے پہلے ایک دو موقعوں پر لڑکی کو چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنایا گیا پھر جب وہ اپنے اسکول کے ساتھ ایک پکنک پوائنٹ پر تھی اسے ڈرامائی طور پر اٹھا لیا گیا۔

پندرہ بیس روز میں کم سن لڑکی کی عزت تو کیا باقی رہنا تھی، وہ بے چاری اپنے ساتھ کئی مسائل بھی لے آئی تھی۔ وہ کئی ماہ سخت ڈپریشن کا شکار رہی پھر اچانک اس کا وزن کم ہونا شروع ہو گیا۔ شروع میں اسے اس بدسلوکی کا نتیجہ سمجھا جو اس کے ساتھ ہوئی تھی مگر پھر ڈاکٹروں نے ایک اور نتیجہ نکالا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ گلے کے غدودوں کی ایک خاص قسم کی بیماری کا شکار ہے۔ یہ بیماری جان لیوا تو نہیں لیکن پوری زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ اس بیماری میں وزن کم ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی کوشش کے باوجود نارمل نہیں ہو پاتا دیگر پیچیدگیاں بھی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ غدودوں کی دیگر بیماریوں کے برعکس یہ بیماری لعابِ دہن وغیرہ کے ذریعے ٹرانسفر بھی ہوتی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ بے چاری یہ مرض ''اغوا کار'' سے لے کر آئی تھی۔ عدیل کی معلومات

کے مطابق اب وہ لڑکی اپنی والدہ کے ساتھ انگلینڈ شفٹ ہو چکی تھی، یہاں وہ ایک مہنگے اور مشکل علاج کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ مصیبت زدہ والد بھی اپنی سیاست اور کاروبار سمیٹ کر بیرون ملک جانے والا تھا اور یہ تو صرف ایک واقعہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ ''باپ'' کی طرح بیٹے کے کردار پر بھی اس طرح کے کئی شرمناک داغ ہوں...... اور اب ایک خطرناک موروثی بیماری والا یہ بدمعاش زادہ اس کی ہیرے جیسی الہام کا شوہر بننے جارہا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ عدیل کا دل اس کے سینے میں خون ہونے لگا۔

جونی اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تو لمبوترے چہرے والے جمشید خاں کے پتلے پتلے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی ہوئی نظر آئی۔ ''سمدھی جی۔ کیسا لگا اپنا ہونے والا داماد؟''

عدیل نے تکلیف محسوس کرتے ہوئے چہرے کا رخ پھیرلیا۔ وہ ذرا تاسف کے ساتھ عدیل کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''مجھے پتا ہے چیمپ! تم میرے خلاف بھرے بیٹھے ہو۔ میں نے تمہیں باکسنگ رنگ میں اترنے پر مجبور کیا اور نتیجے میں تم وہیل چیئر پر آگئے...... لیکن تم بھی جانتے ہو یہ سب عارضی ہے۔ کچھ عرصے میں تمہیں بھلے چنگے ہو جانا ہے اور اگر کوئی تھوڑی بہت پیچیدگی ہوئی بھی تو کیا مسئلہ ہے۔ تمہاری جیب نوٹوں سے فل گرم ہے۔ چھوٹی موٹی ٹریٹ منٹ کے لیے ایک اور چکر یو ایس اے کا لگالینا...... اور اگر نہ بھی لگانا ہوا تو تمہیں کون سی کمی ہے۔ یہاں پاکستان میں بھی تمہیں غیر ملکی علاج جیسی سیون اسٹار سہولت ملی ہوئی ہے۔''

اس کے معنی خیز لہجے پر عدیل نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ ''میں تمہاری اس حسین پڑوسن کا ذکر کررہا ہوں جو تمہاری ٹاپ فین بھی ہے۔ سنا ہے کہ وہ اکثر بڑے پولے پولے ہاتھوں سے تمہارا مساج کرتی ہے اور تمہارے اندر نئی روح پھونکتی ہے۔ بند کمرے میں دو چار ہفتے اس سے فزیوتھراپی کراؤ گے تو سارے مردہ رگ پٹھے زندہ ہو جائیں گے۔''

عدیل حیران ہوا کہ اس شخص کو تابانہ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا ہے اور وہ یہاں اس کا ذکر کیوں کررہا ہے۔ وہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر مستقبل میں تمہارے مردہ رگ پٹھے زندہ ہو جائیں تو بڑا فائدہ ہو سکتا ہے تمہارا۔ مقابلے چاہے نہ کرسکو مگر کوچنگ اور ٹریننگ سے تو پیسا کما ہی سکتے ہو۔ مجھے پتا ہے کہ بہت سے قدرداں ہیں تمہارے۔''

جمشید خاں کی یہ ساری باتیں عدیل کو زہر لگ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی برچھی جیسی کٹیلی آواز سے اس کے کان زخمی ہو رہے ہیں۔ وہ اس کی گفتگو سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''جمشید! الہام کو بلاؤ، میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور دیکھو میرے چیمپ! لیکن دیکھنا ہی نہیں، اسے سمجھانا بھی ہے۔ اچھے بُرے کا بتانا بھی ہے۔ محبت کا یہ کام محبت سے ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ میرا بیٹا تمہاری بیٹی پر فدا ہے...... اور وہ فدا ہی رہے تو ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں بھیج رہا ہوں اُسے، تم دونوں اکیلے میں بات کرسکتے ہو۔''

وہ باہر چلا گیا۔ عدیل کا سینہ دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ جمشید خاں کے ساتھ ہی دونوں چوکس لڑکیاں بھی باہر چلی گئی تھیں۔ تاہم اندازہ یہی ہوتا تھا کہ وہ دروازے کے پاس موجود ہیں۔ وہ صرف ڈیکوریشن پیس نہیں تھیں، ان کی حرکات وسکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جمشید خاں کے گارڈز کی سی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

چند منٹ گزرے پھر بلند دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور الہام نظر آئی۔ سمٹی سمٹائی ہوئی کسی ڈری سہمی چڑیا جیسی۔ اس نے حیرت سے عدیل کو وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھا اور پھر جیسے تڑپ کر اندر آگئی۔ ''پاپا...... پاپا۔''

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور اس کا بازو تھام کر اُس سے لپٹ گئی۔ ''پاپا! یہ کیا ہوا آپ کو؟ آپ چیئر پر کیوں ہیں؟ آپ زخمی ہیں؟'' وہ رو رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں الہامی! بس تھوڑی سی تکلیف ہوئی ہے۔'' اس نے کہا پھر الہام کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی اور سر کو بار بار چوما۔ ''میری بچی...... میری جان......'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ سنبل کی اس آخری نشانی کو ابھی اپنے سینے میں چھپالیتا اور ان ستم گر درو دیوار سے کہیں دور نکل جاتا۔

کمرے کا بلند دروازہ ڈور کلوزر کے ذریعے بند ہو چکا تھا اور وہ اکیلے تھے۔ آنسو عدیل کی آنکھوں میں بھی امڈ کر آنا چاہتے تھے لیکن اگر وہ خود رونے لگتا تو الہام کو کیسے سنبھالتا۔ اس نے خود پر ضبط کیا۔ الہام کے گال اور بال سہلانے لگا۔ اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکنے اور پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ (اس نے اسے سمجھایا کہ سیڑھیوں پر پھسلنے کی وجہ سے کمر پر کچھ ضرب آئی ہے)

وہ بولی۔ ''پاپا! مجھے یہاں سے لے جائیں۔ اب مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جایئے گا۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔'' وہ

ایک بار پھر عدیل کے بازو سے چمٹ گئی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا الہامی! بس تم حوصلہ رکھو۔"

"وہ...... انکل کا بیٹا بہت برا ہے پاپا...... بہت ہی بُرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ...... مجھ سے شادی کرے گا۔ مجھے اپنے ساتھ کسی دوسرے کنٹری لے کر جائے گا۔ پاپا! مجھے کہیں نہیں جانا...... مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔ آپ کے پاس رہنا ہے۔" وہ کسی ہراساں بچے کی طرح اپنا سر عدیل کے سینے میں گھسانے لگی۔

عدیل نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے اور الہام کی کمر تھپکنے لگا۔ وہ اسی طرح عدیل کے ساتھ لگے لگے بولی۔ "پاپا! آپ کو پتا ہے مس تابانہ بھی یہاں ہیں۔"

عدیل بُری طرح چونکا۔ اس نے الہام کو خود سے علیحدہ کر کے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں پاپا! یہ لوگ مس تابانہ کو بھی یہاں لے آئے ہیں۔ پتا نہیں کہ زبردستی لائے ہیں یا وہ خود آئی ہیں۔ یہ چاہتے تھے کہ مس تابانہ مجھے سمجھائیں۔ مجھے "ایگری" کریں کہ میں...... میں......" وہ شرم کے سبب آگے نہ بول سکی۔ یقیناً وہ کہنا یہی چاہتی تھی کہ مس تابانہ کو اس لیے یہاں لایا گیا ہے کہ وہ اسے جونی سے نکاح پر آمادہ کر سکے۔

یہ سب کچھ عدیل کے لیے حیران کن تھا۔ گھر میں اسے کئی روز سے تابانہ نظر نہیں آئی تھی اور آج اس پر انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ تو لاہور میں موجود ہی نہیں تھی۔ وہ یہاں اس نامعلوم ستم گر چار دیواری کے اندر تھی۔ لائی گئی تھی یا خود آ گئی تھی، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

الہام نے اشک بار لہجے میں جو تفصیل بتائی، اس سے معلوم ہوا کہ تابانہ پانچ روز پہلے یہاں پہنچی تھی۔ اس نے الہام کو بتایا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے...... مگر اسے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کہاں اور کس جگہ پر ہے۔ کیونکہ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا ہے اور دو بار سواری بھی تبدیل کی گئی ہے۔ تابانہ نے الہام کو بتایا تھا کہ انکل جمشید ایک بہت طاقتور شخص ہے اور وہ ہر صورت اپنے بیٹے کا نکاح اس سے کرنا چاہتا ہے۔ وہ الہام کو کسی ایسی جگہ پر لے آیا ہے جہاں پولیس پہنچ سکتی ہے اور نہ کوئی دوسرا مددگار۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ انکل کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

"تابانہ اب کہاں ہے؟" عدیل نے بے تابی سے پوچھا۔

الہام اس کے بازو سے لگے لگے بولی۔ "وہ...... بُری حالت میں ہیں پاپا۔ انہیں یہاں پاس ہی ایک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ وہ جو دو لڑکیاں انکل جمشید کے ساتھ ہوتی ہیں، انہوں نے ایک گارڈ کے ساتھ مل کر انہیں بہت مارا بھی ہے۔ یہ دو دن پہلے کی بات ہے۔"

"مارا کیوں ہے؟ اور بند کیوں کیا ہے؟" عدیل کی حیرانی بڑھ گئی۔

وہ دائیں بائیں دیکھ کر مزید دھیمی آواز میں بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ مس تابانہ نے یہاں سے نکلنے کا سوچا تھا...... یا وہ کم از کم...... باہر کسی کو اطلاع دینا چاہتی تھیں۔ شاید آپ کو...... یا پھر چچا جمیل وغیرہ کو......"

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں سب کچھ جانتی ہوں پاپا۔ اس جگہ پر موجود جتنے بھی لوگ ہیں، ان میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔ یہاں پر انٹرکام وغیرہ سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ فون یہاں بس انکل کے پاس ہے یا اُس کے بیٹے کے پاس۔ لیکن یہ فون ایسے ہیں جن کی لوکیشن ٹریس نہیں ہوتی۔ یہ بات مجھے مس تابانہ نے ہی بتائی تھی مگر ان کا خیال تھا کہ بیسمنٹ کے بڑے کمرے میں جو دو لیپ ٹاپ رکھے ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ مدد مل سکتی ہے کیونکہ ان میں نیٹ موجود ہے۔ ان کے ذہن میں تھا کہ اگر وہ نیٹ آن کر سکیں تو اس کے ذریعے وہ یہاں سے باہر کوئی ایسی کال کر سکتی ہیں جو ٹریس ہو سکے اور پتا چل سکے کہ ہم اس وقت کس علاقے میں اور کہاں ہیں۔

"پرسوں رات کی بات ہے جب سب سو رہے تھے مس تابانہ نے رسک لیا اور اس کمرے میں چلی گئیں۔ جہاں لیپ ٹاپ رکھے تھے...... وہ بڑی ذہین ہیں پاپا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک لیپ ٹاپ ایسی جگہ پر پڑا ہے جہاں وہ سی سی ٹی وی کیمرے میں نظر نہیں آ سکتا۔ وہ لیپ ٹاپ کا نیٹ آن کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جب کسی شک کی وجہ سے ایک گارڈ اندر چلا آیا اور اس نے مس کو دیکھ لیا۔ فوراً وہ دونوں لڑکیاں بھی آ گئیں جو ہر وقت انکل کے ساتھ رہتی ہیں۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مس تابانہ کا رنگ فق ہو چکا تھا اور دونوں لڑکیاں ڈانٹنے والے انداز میں مس سے کچھ پوچھ رہی تھیں پھر انکل بھی اپنے گاؤن کی ڈوری باندھتا ہوا آ گیا اور......" الہام کی آواز بھرا گئی اور وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔

عدیل نے اسے پچکارا اس کا شانہ سہلایا۔ "انہوں نے مس تابانہ کو مارا؟"

"ہاں پاپا۔" وہ سسک کر بولی۔ "یہ بڑے بُرے

لوگ ہیں۔ مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے۔ انکل نے مس تابانہ کے پیٹ میں لات ماری پھر وہ دونوں خبیث لڑکیاں ان پر ٹوٹ پڑیں۔ گارڈ نے بھی ان کی ہیلپ کی۔ مس تابانہ اوندھے منہ لیپ ٹاپ والی میز پر گریں اور...... ان کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ وہ انہیں بالوں سے گھسیٹتے ہوئے......" الہام کی آواز دکھ کی شدت سے ایک بار پھر رُندھ گئی۔

عدیل اسے پچکارتا رہا۔ اس کے بال سہلاتا رہا۔ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پاپا! پتا نہیں وہ اب کس حال میں ہیں...... وہ میرے لیے...... صرف میرے لیے یہاں آئی تھیں۔ وہ مجھے نکالنا چاہتی تھیں یہاں سے۔ لیکن اب خود زخمی ہو کر پڑی ہیں۔"

الہام اب صوفے پر بیٹھ کر اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ "تکلیفیں انسانوں پر ہی آتی ہیں الہام، اور ان کو جھیلنا بھی پڑتا ہے۔ تم حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اوپر والے کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

"پاپا! مجھے بس یہاں سے لے جائیں...... میں ایک منٹ بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ آپ کو تو بڑے بڑے لوگ جانتے ہیں پاپا۔ آپ اُن سے مدد لیں۔ ان ذلیل لوگوں کو پکڑوائیں۔" وہ آنسو بہاتی جارہی تھی۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ اور یاد آیا بولی۔ "پاپا! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ رات کو بہت روتی ہوں میں۔ یہ بُرے لوگ ہیں۔ یہاں بیسمنٹ کے ایک پورشن میں بہت سی ایسی لڑکیاں ہیں جو بیمار ہیں۔ کسی وقت اچھی بھلی ہوں گی لیکن اب ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آتی ہیں۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے انہیں؟"

عدیل نے اس سے پوچھا...... "کیا وہ ان سے ملی ہے؟"

الہام نے کہا۔ "نہیں پاپا! بس دور سے دیکھا ہے چھپ کر۔"

عدیل نے کہا۔ "اچھا الہامی اب تم یہ آنسو وغیرہ پونچھ لو۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنے دو کہ میں نے تمہیں سمجھایا بجھایا ہے اور میری اس کوشش سے تم بہت حد تک نارمل ہوتی ہو۔ میری بات فالو کر رہی ہو نا......"

"لیکن......"

"پلیز الہام۔" عدیل نے تیز سرگوشی کی۔ "میری مشکل اور مت بڑھاؤ۔ جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے کرو۔ اپنے آپ کو پُرسکون کرلو اور اپنے کمرے میں جاؤ...... کہاں ہے تمہارا کمرا؟"

"نیچے بیسمنٹ میں۔"

"بس اب تم اپنے کمرے میں رہو، ہو سکے تو دروازہ اندر سے بند کرلو۔ اب تمہیں اپنے کمرے میں ہی رہنا ہے۔"

"آ...... آپ کیا کریں گے پاپا؟"

"کچھ نہیں، بس اس انکل جمشید سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے طریقے سے سمجھانا چاہتا ہوں......"

دروازہ کھلا اور جمشید خاں کا منحوس چہرہ نظر آیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں جی، دکھ سکھ ہو گئے باپ بیٹی میں؟" اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ گفتگو کی طوالت اُسے پسند نہیں آئی۔

عدیل نے الہام کا شانہ تھپکا اور اُسے جانے کا کہا۔ وہ اٹھی اور سر جھکا کر باہر نکل گئی۔ جمشید خاں اسے ٹٹولتی ہوئی

نظروں سے دیکھتا رہا پھر لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آ گیا۔

"کیا رزلٹ نکلا چیمپ؟" اس نے صوفے پر پھیلتے ہوئے پوچھا۔

"وہی نکلے گا جو تم لوگ چاہ رہے ہو۔"

"لیکن ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" اس کا لہجہ کھردرا ہو گیا۔

اسی دوران میں بانس کا بانس مرجان عرف جونی بھی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر آ گیا۔ عدیل نے کہا۔

"وہ بہت زیادہ اَپ سیٹ ہے جمشید خاں۔ میں نے کوشش کی ہے اور وہ کچھ سمجھی بھی ہے۔ لیکن مجھے مزید بات چیت کرنا پڑے گی اُس سے۔"

"میں نے تم سے بس دو گھنٹے کا وعدہ کیا تھا۔"

"مگر میں نے دو گھنٹے تو بات نہیں کی اُس سے۔ شاید ایک گھنٹا اور دس پندرہ منٹ رہی ہے وہ میرے ساتھ۔"

"تو تم دوسرا دور چاہتے ہو؟"

"ہاں جمشید خاں......" عدیل نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "لیکن یہ الہام کی ٹیچر والی بات میں کیا سن رہا ہوں؟ تم اسے بھی پکڑ کر یہاں لے آئے ہو؟"

اس نے قیمتی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "اسے پکڑ کر کوئی نہیں لایا۔ اسے میں نے بس تجویز دی تھی۔ وہ خود یہاں آئی ہے لیکن جس مقصد کے لیے وہ یہاں آئی تھی، وہ مقصد پیچھے رہ گیا اور وہ کچھ نیا کرنے کے چکر میں پڑ گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ اسی کام سے یہاں آئی تھی جس کے لیے تم آئے ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ الہام کو سمجھائے بجھائے گی۔ اس کے ذہن میں اگر کوئی اندیشے ہیں تو انہیں دور کرنے کی کوشش کرے گی مگر وہ تو اندیشوں کے بجائے اسے ہی دور کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔ حرام زادی نے دھوکا دینا چاہا، لیپ ٹاپ تک پہنچ گئی۔ اس کا نیٹ آن کرنا چاہا۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"فی الحال بند کیا ہوا ہے اس لیڈی جیمز بانڈ کو...... تھوڑی سی مرمت بھی کرنا پڑی ہے لیکن گھبراؤ مت۔ میں جانتا ہوں تم دونوں کا آپس میں ٹانکا ہے، چھوڑ دوں گا اُس کو...... بلکہ تم دونوں کو اکٹھے ہی چھوڑ دیں گے نکاح کے بعد۔"

عدیل کے جسم میں آتش بھڑک رہی تھی۔ جمشید خاں اور اس کے بیٹے کی صورتیں اسے زہر لگ رہی تھیں۔ اب رات کے دو بج چکے تھے۔ عمارت کا یہ پورشن بالکل خاموش تھا۔ یہاں ان دو نیم عریاں لڑکیوں اور ایک مسلح گارڈ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یقیناً زیادہ سیکیورٹی کی جمشید خاں کو ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہاں عمارت کے بیرونی حصے میں مسلح گارڈز اور سخت سیکیورٹی کے آثار نظر آئے تھے۔

"اب آپ کیا چاہتے ہو ڈیڈی جان؟" جونی نے تمسخر کا انداز اختیار کیا۔

"میں چاہتا ہوں الہام کو کچھ دیر سوچنے کا موقع دوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس سے دوبارہ بات کرتا ہوں، لگتا ہے وہ سمجھ جائے گی۔"

"سمجھ تو وہ سب گئی ہے ڈیڈی جان، آپ کے لاڈ پیار کی وجہ سے آپ کو ایکسٹرا نخرے دکھا رہی ہو گی۔" وہ شریر لہجے میں بولا۔

"شٹ اَپ جونی، تمیز سیکھو...... تمہارے بڑے ہیں۔" جمشید خاں نے مصنوعی خفگی سے کہا پھر وہ عدیل سے مخاطب ہو کر بولا۔ "سوری چیمپ! بچہ ہے۔ آہستہ آہستہ سیکھ جائے گا۔"

"سیکھ جائے گا اور جو لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے ہیں انہیں سکھا بھی دے گا۔" جونی نے پھر معنی خیز انداز میں عدیل کو چرکا لگایا۔

جمشید نے اسے گھورا۔ "جونی! مائنڈ یور لینگویج۔ اگر چپ نہیں بیٹھ سکتے تو باہر چلے جاؤ۔"

وہ صوفے پر اپنی لمبی ٹانگیں پھیلا کر اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جمشید خاں، عدیل سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ بیٹی کے نکاح کے بعد وہ بخیر و عافیت اپنے گھر واپس پہنچ جائے گا۔ تابانہ کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔ یہاں سے جانے کے بعد ان کے دماغوں میں اگر کوئی کیڑا رینگے تو اسے فوراً ہی مار دیا جائے۔ کیونکہ کسی طرح کی تلاش یا جوابی کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ یہ حماقت اور ہلاکت کے زمرے میں آئے گی۔

آخر میں اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "چیمپ! تمہارا یہ خاکسار، نیا رشتے دار کہیں موجود نہ ہونے کے باوجود بہت سی جگہوں پر موجود ہوتا ہے۔ کافی جگہوں پر دیکھ لیتا ہوں میں...... اگر تم اسے اپنے منہ میاں مٹھو بننا نہ سمجھو تو کہوں گا کہ میرے بہت سے ہاتھ ہی نہیں، بہت سی آنکھیں بھی ہیں۔ یہ آنکھیں شہر کے اندر دیکھتی ہیں۔ دیواروں اور پردوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے، وہ اکثر جان لیتی ہیں۔"

وہ اپنی انٹیلی جنس اور جانکاری کی خبریں سنا رہا تھا، اپنی دھاک بٹھا رہا تھا۔ بے شک وہ بہت ہوشیار باش

تھا...... بے شک بہت کچھ جانتا تھا...... لیکن...... وہ ایک خاص بات نہیں جانتا تھا۔ وہ ان خاص لمحوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا جو کراچی کے اسپتال میں عدیل پر وارد ہوئے تھے۔ مقابلے کے بعد اسپتال کے کمرے میں اس نے آنکھ کھولی تھی اور پھر اس پر وہ انکشاف ہوا تھا جس نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہوشربا لمحے...... وہ انکشاف انگیز گھڑیاں...... اُس نے ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ حتیٰ کہ جمیل کو بھی نہیں۔ صرف اور صرف وہ جانتا تھا کہ اس کی کمر کا مسئلہ اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ وہ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔ معجزے ایسے ہی رونما ہوتے ہیں۔ انسانی عقل کو ایسے ہی انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے...... اس رات ہوش میں آنے کے بعد اس نے بستر پر لیٹے لیٹے تپائی کی طرف گھوم کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور اسے معلوم ہوا تھا کہ گھومتے ہوئے، درد کی جو لہر اس کی کمر میں اٹھا کرتی ہے، وہ نہیں ہے۔ اس نے تصدیق کے لیے کمر کو دوبارہ حرکت دی تھی اور نتیجہ وہی رہا تھا۔ درد او جھل تھا۔ تب اس نے بڑی احتیاط سے خود کو بستر سے اٹھایا تھا اور یہ جان کر بھونچکا رہ گیا تھا کہ اس کی کمر میں کہیں کھچاؤ نہیں...... کہیں اینٹھن نہیں۔ وہیں بستر پر اس نے اپنی کمر کو دو تین مختلف اینگلز میں حرکت دی تھی اور پھر بے سدھ سا بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اسے یہی لگا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کمر کے مہروں کی سنگین تکالیف میں کبھی کبھی ایسے کرشمے بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرف سے سنگین قسم کی سرجری تجویز کی جا رہی ہوتی ہے اور اچانک ہی کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی علاج کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ شاید گنجے کو لات راس آ جانے والی بات بھی اسی تناظر میں کہی جاتی ہوگی۔ ان ہوشربا لمحوں میں عدیل کو امریکن ڈاکٹر کی یہ بات بھی یاد آئی تھی کہ مہروں کی ایسی سنگین تکالیف کبھی کبھی حیرت انگیز طور پر اچانک ہی دور ہو جاتی ہیں...... کراچی اسپتال کے وہ سارے شب و روز عدیل کو یاد تھے۔ شاید اگلے روز اس کرشمے کی پوری تصدیق ہونے کے بعد وہ جمیل کو یہ خبر سنا ہی دیتا مگر پھر جشید خاں کی وہ منحوس کال آ گئی تھی جس میں اس نے معاہدے سے انحراف کا اشارہ دے دیا تھا اور اپنے اوباش بیٹے کے ”رومانس“ کا بتا دیا تھا۔ تب ایک جدا خیال کے تحت عدیل نے اپنی کمر کے راز کو راز ہی رہنے دیا تھا اور آج...... پندرہ بیس روز بعد اس سنگین شب میں وہ بظاہر معذوب حالت میں وہیل چیئر پر جمشید خاں کے رُوبرو موجود تھا۔

”ہاں انڈر ورلڈ کا یہ بدمعاش جمشید خاں بہت کچھ جانتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ جو بے بس باپ وہیل چیئر پر بے حس و حرکت بیٹھا ہے اور اپنی بیٹی کے دلدوز دُکھڑے سن رہا ہے، وہ بے بس نہیں ہے۔ اس کے سینے میں آگ ہی نہیں، اس کے جسم میں اتنی ہمت بھی ہے کہ وہ اس تنہا پورشن میں ڈان اور ”ڈان زادے“ پر جھپٹ سکے۔

جمشید خاں نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے لمبوترے چہرے پر ہاتھ چلایا اور بولا۔ ”چیمپ! لگتا ہے کہ تم چیئر پر بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو۔ اگر چاہو تو تمہیں کچھ دیر کے لیے ساتھ والے کمرے میں لٹایا جا سکتا ہے۔“

عدیل خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے جمشید نے دور گوشے میں کھڑے گھبرے سانولے گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ وہیل چیئر کے قریب آیا تاکہ اسے گھما کر قریبی دروازے کی طرف لے جا سکے۔ چیئر کی ہینڈ بریک ہٹانے کے لیے جونہی وہ نیچے جھکا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عدیل کا دایاں زوردار مُکا اس کے تھوبڑے پر پڑا اور وہ الٹ کر شیشے کی تپائی کو چکنا چور کر گیا۔

عدیل نے وہیل چیئر چھوڑ دی۔ حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد جونی، آنکھیں نکال کر عدیل پر جھپٹا۔ اس نے جونی کا مُکا بڑی آسانی سے بچایا اور جوابی مُکے سے اسے دور تک لڑھکا دیا۔ یہ کسی عام شخص کا نہیں تجربہ کار باکسر کا مُکا تھا۔ جونی کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز سُنی جا سکتی تھی۔ جمشید خاں کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ وہ پلٹ کر الماری کی طرف بھاگا۔ وہ الماری کی دراز میں سے کچھ نکالنے جا رہا تھا۔ بپھرا ہوا عدیل اس کی جانب لپکا۔ عین اس وقت جب جمشید دراز کھول چکا تھا، عدیل نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ وہ کسی مچھلی کی طرح تڑپا مگر گرفت سے نکل نہیں سکا۔ عدیل نے دایاں ہاتھ بڑھایا اور کھلی ہوئی دراز میں سے ”گلاک 17 پسٹل“ نکال لیا۔

گارڈ اب سنبھل کر پھر عدیل کی طرف جھپٹنا چاہ رہا تھا۔ عدیل نے پسٹل جمشید خاں کی کنپٹی پر رکھا اور گرجا۔ ”خبردار مار دوں گا اِسے۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسی وحشت تھی کہ تنومند گارڈ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف دھان پان بدمعاش زادہ اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے بھی باپ کی کنپٹی پر پسٹل کی نال دیکھ لی تھی۔

جمشید خاں کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گلے سے آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا تھا

اور ناگواری بُو عدیل کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ شاید ایسی ہی بو اس کے بیٹے کے جسم سے بھی اٹھتی تھی۔

''کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا تو مار ڈالوں گا اُس کو۔'' عدیل پھر دہاڑا۔

یہی وقت تھا، جب سامنے والا دروازہ دھماکے سے کھلا اور مختصر لباس والی دراز قد لڑکی نظر آئی۔ کمرے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور وہ پتھر کا بُت بن گئی۔

''دروازہ بند کرو...... جلدی۔'' عدیل نے سائیلنسر لگے پسٹل کی نال جمشید خاں کی کنپٹی میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔ دباؤ کے سبب جمشید خاں کی گردن ستّر کے زاویے پر مڑ گئی۔ اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کہاں تھا کہ مقابلے کے بعد کمر کو مکمل طور پر چھٹا کر بیٹھا ہوا مفلوج عدیل یوں اچانک جھپٹ پڑے گا۔

لڑکی نے خوف زدہ نظروں سے باس کی طرف دیکھا اور عدیل کے حکم پر دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔

پسٹل کی نال کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ رگڑ سے جمشید خاں کی کنپٹی سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ عدیل نے جانچ لیا تھا کہ جمشید کے لباس میں فی الحال کوئی ہتھیار نہیں ہے اور یہ بھی جانچ لیا تھا کہ بیٹے جونی کی جیکٹ میں ہتھیار ہے۔ وہ خطرناک لہجے میں بولا۔ ''حرامی باپ کے حرامی بیٹے! اپنا پستول نکال کر میری طرف پھینک دے اور اپنا موبائل بھی...... ورنہ ابھی یہاں گولی چلے گی اور بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔''

ضدی اور اڑیل جونی پس و پیش سے کام لینے لگا۔ اس کے گڑبڑ تاثرات دیکھ کر عدیل نے پسٹل کی نال جھکا کر بے دریغ جمشید خاں کی پنڈلی پر فائر کیا۔ 'ٹھک' کی مہلک آواز کے ساتھ ہی جمشید خاں بے طرح اُچھلا اور اپنے گلے سے گھٹی گھٹی آوازیں نکالنے لگا۔ ''اگلا فائر اس کے پیٹ میں جائے گا۔'' عدیل وحشت میں پھنکارا۔

عدیل کے حکم پر جونی نے اپنا سلور کلر کا قیمتی پستول نکالا اور اسے بیرل کی طرف سے پکڑ کر عدیل کی طرف اُچھال دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے موبائل کے ساتھ بھی یہی کیا۔

''الہام کی ٹیچر کہاں ہے؟'' عدیل نے پوچھا۔

جونی نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر ٹوٹے جبڑے کی وجہ سے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ عدیل نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی زرد چہرے کے ساتھ گم صم کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی تابانہ کے بارے میں جانتی ہے۔ عدیل نے اپنے شکنجے میں پھنسے ہوئے جمشید خاں کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ ''جمشید خاں، میرے سر پر خون چڑھا ہوا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، اس کے بعد میرے ساتھ کچھ بھی ہو جائے۔ اس اپنی رکھیل سے کہو کہ جائے اور تابانہ کو لے کر آئے۔''

جمشید خاں کے اندر کے ''ڈان'' نے ایک بار پھر جوش مارا۔ اس نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی اور پھنکار کر کچھ کہا۔ عدیل کے سر پر واقعی خون سوار تھا۔ اس نے بلاتردد گلاک پسٹل سے دوسرا فائر کیا۔ اس مرتبہ جمشید خاں کی دوسری ٹانگ نشانہ بنی۔ وہ اُچھلا اور عدیل کی گرفت میں مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ اس کی پہلی ٹانگ خون سے رنگین ہو چکی تھی، اب دوسری بھی ٹخنے کے پاس سے گھائل ہو گئی۔

''جمشید! اگلا فائر تجھے بہت زیادہ نقصان پہنچائے گا۔ اس لڑکی سے کہہ الہام کی ٹیچر کو لے کر آئے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جمشید خاں کی لمبی گردن پر سے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔

تکلیف کی شدت سے ٹوٹتی ہوئی آواز میں جمشید خاں نے لڑکی کی طرف دیکھ کر ''مونا'' کہا اور ساتھ ہی اثبات میں سر ہلا یا۔

مطلب یہی تھا کہ وہ ''مونا'' کو عدیل کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ''کوئی چالاکی نہ دکھانا لڑکی، نہیں تو پچھتانے کا موقع نہیں دوں گا۔'' عدیل نے بلند آواز سے کہا۔

لڑکی لرزاں قدموں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھی اور پھر ایک کمرے کا دروازہ ان لاک کر کے تابانہ کو باہر لے آئی۔ تابانہ کے تراشیدہ بال اس کی پیشانی پر منتشر تھے۔ اگر عدیل کو پتا نہ ہوتا کہ وہ زخمی ہے تو شاید وہ اسے پہچان ہی نہ سکتا۔ اس کے چہرے کی ایک سائڈ اس بُری طرح سوجی ہوئی تھی کہ ایک آنکھ بند ہو گئی تھی اور نصف چہرہ نیلگوں ہو چکا تھا۔ اس کی گردن اور کندھے پر بھی زخم دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بھی ریلنگ کے پاس ہکا بکا کھڑی عدیل کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ مختصر لباس والی لڑکی مونا کے ساتھ زینے اترتی ہوئی نیچے آئی۔ ''وہیں رک جاؤ تابانہ۔'' عدیل نے تحکم سے کہا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ وہ فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ پسٹل اٹھاؤ اور یہ موبائل بھی قبضے میں کرو۔''

تابانہ کو یہ سارا سنسنی خیز منظر حیرت زدہ کر رہا تھا اور یقیناً یہ بات بھی حیرت زدہ کر رہی تھی کہ بستر پر مشکل سے حرکت کرنے والا عدیل جمشید خاں کو اپنے شکنجے میں لیے کھڑا

تھا۔ جمشید کی ٹانگیں لہولہان تھیں اور اس کے تنومند گارڈ کا تھوبڑا بھی خون سے رنگین تھا۔ بہرطور اس نے عدیل کی ہدایات پر تیزی سے عمل کیا۔ تب اس نے عدیل کی طرف دیکھ کر جذباتی لہجے میں پوچھا۔ ''سر! الہام ملی ہے آپ کو؟''

''ہاں، وہ نیچے بیسمنٹ میں ہے۔ تم راستہ جانتی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''تو جاؤ اور اُسے لے کر آؤ۔'' پھر وہ ذرا ٹھٹکا۔ مونا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''وہ تمہاری دوسری ساتھی کہاں ہے؟''

''وہ یہاں اس پورشن میں نہیں ہے۔''

''نیچے بیسمنٹ میں ہے؟'' عدیل نے پوچھا۔

''نہیں...... اس کو بلڈنگ سے باہر جانا پڑا ہے۔''

عدیل دہاڑا۔ ''دیکھو، مجھ سے کوئی غلط بیانی نہ کرنا۔ میں مرو اور مارو کی پوزیشن میں ہوں۔ کچھ بھی کر گزروں گا۔''

لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بار پھر اپنا بیان دہرایا۔

عدیل کی چھٹی حس بھی یہی کہہ رہی تھی کہ عمارت کے اس رہائشی پورشن میں باپ بیٹے کے علاوہ فقط یہ لڑکی مونا اور گہرے سانولے رنگ والا گارڈ ہے۔ پورشن کا دروازہ وہ اندر سے لاک کروا چکا تھا۔ اب باہر سے کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ وہ تابانہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابانہ پسٹل لوڈڈ ہے؟''

''جی سر۔''

''چلا لوگی نا؟''

''کیوں نہیں سر۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ سوجن کے سبب اس کی صورت ناقابلِ شناخت ہو رہی تھی۔

''تو جاؤ، الہام کو لے آؤ۔ اگر کوئی سامنے آئے تو ایک سیکنڈ ضائع نہ کرنا۔ اُڑا دینا اس کو۔'' وہ جانتا تھا کہ تابانہ کوئی چھوئی موئی لڑکی نہیں ہے...... وقت پڑنے پر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ الہام کو بیسمنٹ میں سے نکال کر لے آئے گی...... اور ایسا ہی ہوا۔ قریباً تین منٹ بعد وہ الہام کو اپنے ساتھ لیے ہوئے بیسمنٹ کے زینوں کی طرف سے برآمد ہوگئی۔ جذباتی مشقت کے سبب اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ الہام بھی ششدر نظر آ رہی تھی۔ اس دوران میں عدیل نے کمرے کے ایک ایک انچ پر عقابی نظر رکھی ہوئی تھی۔ لڑکی مونا...... سانولا گارڈ اور دونوں باپ بیٹا اس کی نگاہوں کے حساس ریڈار پر تھے۔ جونی نے دوزانو بیٹھ کر اپنا سر جھکا رکھا تھا اور منہ ہاتھوں میں دبا رکھا تھا۔ گاہے گاہے اس کی کراہ گونجتی تھی اور اس شدید تکلیف کا پتا دیتی تھی جو ٹوٹے جبڑے کے سبب اسے جھیلنا پڑ رہی تھی۔ یقیناً باپ کی طرح وہ بھی ششدر تھا کہ وہیل چیئر پر بمشکل یہاں پہنچنے والا شخص ان کے لیے اتنا خطرناک و مہلک کیسے ثابت ہو گیا ہے۔

الہام نے جذباتی انداز میں عدیل کی طرف لپکنا چاہا مگر عدیل نے اسے فاصلے پر رکنے کی ہدایت کی۔ وہ زخمی جمشید خاں کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جمشید خاں کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش نہیں ہے، انڈرورلڈ کا نہایت خطرناک اور تجربہ کار شخص ہے۔ اس کے سامنے ذرا سی چُوک بھی پانسا پلٹ سکتی تھی۔

عدیل نے لڑکی مونا سے پوچھا۔ ''یہاں اور کون کون ہے؟''

''یہاں اور کوئی نہیں، جو تھے وہ آپ کے سامنے ہیں۔'' وہ منمنائی۔

''میں اس پورشن کی بات نہیں کر رہا۔ پوری عمارت کی بات کر رہا ہوں۔ باہر کتنے گارڈز اور ملازم ہیں اور دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔ میں اس وقت جھوٹ بولنے پر بھی جان لے سکتا ہوں۔''

لڑکی مونا نے رک رک کر جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ باہر چھ مسلح افراد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مالی، ایک ڈرائیور اور دو گھریلو ملازم ہیں۔ ہیڈ گارڈ کا نام ورقا خاں معلوم ہوا۔ عدیل نے تابانہ کو ہدایت کی اور وہ، تار کے بغیر والا انٹرکام عدیل کے پاس لے آئی۔ عدیل نے انٹرکام جمشید خاں کو تھمایا اور اسے حکم دیا کہ وہ ورقا خاں کو اندر بلائے۔ کچھ مزاحمت اور کچھ پس و پیش کے بعد جمشید خاں نے ورقا خاں کو بلا لیا۔ درحقیقت جمشید خاں کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ اس حقیقت کو سمجھ رہا تھا کہ اگر زیادہ دیر ہوگئی تو اسے ''وفات پانے کے لیے'' گولی وغیرہ کی حاجت نہیں رہے گی۔

دو منٹ بعد ورقا خاں اندر آ گیا۔ وہ ایک لمبا چوڑا روایتی گارڈ نظر آتا تھا۔ ایک مشین پسٹل اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ تابانہ نے سلور کلر پسٹل دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کا رخ ورقا خاں کے سینے کی طرف کر لیا تھا۔ عدیل کا پسٹل جمشید خاں کی کنپٹی پر تھا۔ اور سرمئی قالین اس کی ٹانگوں سے بہنے والے خون کے سبب سرخ ہو رہا تھا۔

چند ہی سیکنڈ میں خونخوار صورت والے ورقا خاں نے خود کو اس پوزیشن کے سامنے بے بس محسوس کیا۔ عدیل نے دوٹوک لہجے میں اسے حکم دیا۔ ''اپنے پانچوں ساتھیوں کو یہاں اس کمرے میں بلاؤ...... فوراً۔''

بہتے خون کی وجہ سے جمشید خاں کا رنگ زرد ہوتا جا رہا

تھا۔ ویسے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں کوئی بہت زیادہ خون نہیں ہوگا۔ جمشید نے جب ورقا خاں کو پس و پیش کی کیفیت میں دیکھا تو خود ہی بول اٹھا۔ ''ورقا خاں!'' اس کی آواز تکلیف کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ورقا خاں، عدیل کی ہدایت پر عمل کرے۔ ورقا خاں نے اپنا انٹرکام استعمال کیا اور باہر موجود اپنے ساتھیوں کو بغیر ہتھیار کے اندر آنے کا حکم دے دیا۔ سب کچھ عدیل کی مرضی اور منشا کے مطابق ہو رہا تھا اور اس کی وجہ وہی نیلی آگ تھی جو اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی اور جس نے اسے ہر اندیشے اور مصلحت سے یکسر بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بس اپنی معصوم الہام کی صورت تھی اور وہ کسی بھی قیمت پر اسے یہاں سے نکالنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد ورقا خاں کے پانچوں ماتحت اور تینوں ملازم اس بڑے کمرے میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک ماتحت گارڈ کسی 'اندیشے' کے تحت ایک بریٹا پسٹل اپنی جیکٹ میں رکھ کر لے آیا تھا۔ تابانہ کو اس کی پھولی ہوئی جیکٹ پر شک گزرا۔ یہ شک کارآمد ثابت ہوا اور وہ پسٹل بھی اس سے نکلوا لیا گیا۔ اب وہ سب کے سب قالین پر بیٹھے تھے اور ہراساں نظروں سے اپنے باس کی طرف دیکھ رہے تھے جو کرب اور بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔ عدیل اور تابانہ سچویشن پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ الہام سمیت یہاں سے بحفاظت نکل جائیں گے مگر کیا واقعی ایسا ہو سکے گا؟ عدیل کو اس پر پوری طرح یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔ موچھیل ورقا خاں نے عدیل کو مخاطب کر کے طیش آمیز لہجے میں کہا۔ ''باکسر! تم جو کرنا چاہتے ہو جلدی کرو۔ بڑے مالک کا خون نکل رہا ہے۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو یہاں کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔''

''ہم یہاں سے نکل رہے ہیں اور تمہارا بڑا مالک ہمارے ساتھ جائے گا۔ تمہارے بڑے مالک سے میری دشمنی میری بیٹی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ مجھے تم سب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ یہاں سے محفوظ فاصلے پر پہنچ کر میں اسے کسی بھی اسپتال یا کلینک کے سامنے چھوڑ دوں گا مگر شرط یہی ہے کہ کوئی ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

ورقا خاں اور جونی نے ایک ساتھ سوالیہ نظروں سے جمشید خاں کی طرف دیکھا۔ سرمئی قالین پر سرخ پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ جمشید خاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ عدیل کی شرائط مان رہا ہے۔

عدیل نے ورقا خاں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم سب، ہمارے یہاں سے نکلنے تک اس کمرے میں رہو گے۔ ہم دروازے کو باہر سے مقفل کر رہے ہیں۔''

''جو کرنا ہے، جلدی کرو۔'' جونی نے اپنے ٹوٹے ہوئے جبڑے کے ساتھ بمشکل بولتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کی آنکھوں میں الہام کو دیکھ کر جو بجلیاں سی چمکتی تھیں، وہ بالکل بجھ چکی تھیں۔

یہی وقت تھا جب چند قدم کے فاصلے پر کھڑی، مختصر لباس والی مونا، بولی اور اس کے فقرے نے عدیل اور تابانہ کو بے طرح چونکا دیا۔ ''آپ لوگ یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں عدیل سے مخاطب ہوئی تھی۔ ''اس کمرے کے دروازے میں اس وقت 440V کا کرنٹ دوڑ رہا ہے۔ دروازے کے اوپر اندر اور باہر سینسرز لگے ہوئے ہیں۔ وہ چہرہ پہچان کر گزرنے کی اجازت دیتے ہیں۔''

عدیل اور تابانہ حیرت سے مونا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باقی بھی حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر ان کی نگاہوں میں حیرت کے علاوہ غصہ بھی تھا۔

عدیل نے دیکھا لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ وہ عدیل کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ کامیابی کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں...... کیونکہ...... میں بھی جانا چاہتی ہوں۔''

عدیل نے دیکھا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ورقا خاں کا چہرہ ٹوٹے برتن جیسا دکھائی دینے لگا تھا۔ لڑکی نے چند جملوں میں تیزی کے ساتھ جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اندر داخل ہونے سے پہلے ورقا خاں نے اسٹیل کے اس سلائڈنگ دروازے کا سیکیورٹی سسٹم آن کر دیا ہے۔ اب اپنی پہچان کرائے بغیر یہ دروازہ کسی کو باہر سے اندر اور اندر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔

لڑکی مونا کی آنکھوں سے ''بغاوت'' صاف جھلک رہی تھی اور یہ بغاوت انڈر ورلڈ کے اس بدمعاش جمشید خاں اور اس کے بیٹے کے لیے تھی۔ مونا نے جو کچھ کہا تھا، اس کی تصدیق بھی فوراً ہو گئی۔ عدیل کی ہدایت پر تابانہ نے لوہے کا ایک راڈ، دروازے کی طرف اچھالا تو اسپارک صاف نظر آیا۔ ورقا خاں اور جونی وغیرہ اب سخت تلملائے ہوئے تھے۔ تاہم وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ عدیل نے گن پوائنٹ پر ہی ورقا خاں سے دروازے کے سیکیورٹی سسٹم کو ''ان ڈو'' کروایا۔ جمشید خاں کسی نڈھال چھپکلی کی طرح اس کی گرفت میں تھا، وہ بڑی احتیاط سے اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ پہلے اس نے الہام، تابانہ اور لڑکی مونا

کو باہر نکالا پھر خود بھی نکل آیا اور مونا کو حکم دیا کہ وہ اسٹیل کے دروازے کو باہر سے مقفل کر دے۔

عمارت کے کوریڈورز اور لابی وغیرہ میں سی سی ٹی وی کیمرے موجود تھے مگر اب عدیل کو ان کی پروا نہیں تھی۔ ان کیمروں سے جو لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے، وہ ہال کمرے میں بند تھے۔ لڑکی مونا، ان کی رہنمائی کرتی ہوئی انہیں پورچ تک لے آئی۔ وہ مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ البتہ عدیل ابھی تک اس پر پوری طرح بھروسا نہیں کر رہا تھا۔ اس نے تابانہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس پر نظر رکھے۔ وہ پورچ میں پہنچے تو وسیع گراسی لان کی طرف سے آنے والی یخ ہوا نے ان کا استقبال کیا۔ یہ رات کے قریباً تین بجے کا عمل تھا۔ گہرے کہرے نے اردگرد کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مختصر لباس والی مونا سردی کے سبب اپنے آپ میں سمٹی جا رہی تھی۔ وہ شاید عدیل اور تابانہ وغیرہ سے بھی زیادہ بے تاب تھی، جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

پورچ میں تین گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک سیاہ ہیڈ فورڈ جیپ کی چابیاں عدیل نے حاصل کر لی تھیں۔ تابانہ نے جیپ میں گھس کر اس کو اسٹارٹ کیا اور فیول وغیرہ چیک کیا۔ ''ٹھیک ہے جی۔'' وہ باہر آ کر بولی۔

''ڈرائیو کر لو گی نا؟''

''کیوں نہیں جی۔'' وہ بولی۔ سوجن کے سبب اس کا منہ بولتے ہوئے مزید بگڑ جاتا تھا۔

اب اندر سے ایسی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ بند کمرے کا سلائڈنگ ڈور توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ابھی تک سب ٹھیک جا رہا تھا...... لیکن سب ٹھیک نہیں تھا۔ الہام خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''پاپا...... پلیز جلدی کریں۔''

جمشید خاں کی دُبلی گردن بدستور عدیل کے شکنجے میں تھی۔ زخمی ٹانگوں کی وجہ سے اس کی مزاحمت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ چلنے کے قابل نہیں تھا۔ عدیل اسے اپنے ساتھ قریباً گھسیٹتا ہوا یہاں تک لایا تھا۔ اس کی لہولہان ٹانگوں کے گھسٹنے کے نشان دور تک نظر آ رہے تھے۔ وہ کسی وقت دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کرتا تھا جیسے اسے اب بھی کسی جانب سے مدد کی امید ہو۔

اس کا خیال سو فیصد غلط نہیں تھا۔ ان لمحوں میں عدیل اور تابانہ مختصر لباس والی اُس دوسری لڑکی کو یکسر بھولے ہوئے تھے جو عمارت میں موجود نہیں تھی۔

پورچ کی روشنی میں عدیل نے یکایک تابانہ کا رنگ بدلتے دیکھا۔ اس نے عدیل کے عقب میں دیکھا تھا پھر یکایک وہ چلاتی ہوئی ایک طرف جھپٹی۔ عدیل نے پلٹ کر دیکھا، وہ کسی سے لپٹی ہوئی تھی پھر وہ اور اس کا مدِمقابل لان کے گملوں کے اوپر گرے جولڑکی تابانہ کے نیچے تھی یہ وہی مختصر لباس والی گارڈ تھی جسے عدیل نے اندر دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ایک فٹ لمبا دندانے دار خنجر چمک رہا تھا۔ تابانہ کے نیچے لیٹے لیٹے اس نے بیدردی سے خنجر تابانہ کے بائیں پہلو میں گھونپ دیا۔ الہام دہشت زدہ انداز میں چلا کر عدیل کے پہلو سے آ لگی تھی۔ تابانہ کی مدمقابل نے بس ایک وار پر اکتفا نہیں کیا۔ بڑی وحشت کے عالم میں اس نے اوپر تلے دو وار مزید کیے۔ ایک وار تابانہ نے جزوی طور پر روکا لیکن دوسرا پھر اس کے پہلو میں گھس گیا۔ وہ درد سے چلائی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ دونوں ابھی تک گتھم گتھا تھیں۔

یہی وقت تھا جب دھند میں لپٹے ہوئے درختوں کے اندر سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ ایک تو سیاہ جیپ کی باڈی میں لگا، دوسرے نے ٹی میل گارڈ مونا کو ہٹ کیا۔ وہ جیپ کے دروازے سے ٹکرا کر اوندھے منہ گر گئی۔

عدیل نے تاریکی میں چمکنے والے شعلے کی وجہ سے فائر کرنے والے کی لوکیشن دیکھ لی تھی۔ اس نے سائیلنسر لگا گلاک پسٹل جمشید خاں کی کنپٹی سے ہٹایا اور حملہ آور کو نشانہ بنایا۔ پہلا فائر ہی کارگر ثابت ہوا۔ عین اپنے سر میں گولی کھا کر وہ یخ بستہ گھاس پر گرتا دکھائی دیا۔

تابانہ اور حملہ آور لڑکی بدستور برسرِ پیکار تھیں۔ دو زخم...... بلکہ کاری زخم کھانے کے بعد تابانہ میں وہ توانائی تو نہیں رہی تھی تاہم اس نے خود کو مزید نقصان سے بچانے کے لیے مدِمقابل کے خنجر والے ہاتھ کی کلائی جکڑ رکھی تھی اور اسے کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ دونوں اس طرح گتھم گتھا تھیں اور اوپر نیچے ہو رہی تھیں کہ عدیل حملہ آور لڑکی پر فائر بھی نہیں کر سکتا تھا اور ملائی نقوش والی وہ لڑکی بھی کوئی معمولی حریف نہیں تھی، جیسا کہ بعدازاں پتا چلا، تابانہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے والی وہ چوڈن نامی بری لڑکی بلیک بیلٹ تھی اور نہایت خطرناک فائٹر تصور کی جاتی تھی۔ اس نے تابانہ کو اپنے سر کی ضربات سے مزید لہولہان کر دیا تھا مگر وہ کسی صورت اس کی کلائی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کے پہلو سے بہنے والا خون پورچ کے فرش پر گل کاریاں کرنے لگا تھا۔

یکایک تابانہ کا داؤ چل گیا۔ اس نے مدِمقابل کے

نیچے ہونے کے باوجود اسے ایک فرشی داؤ لگایا اور بے بس کر ڈالا۔ مدِمقابل کا بازو اس بُری طرح مڑا تھا کہ خون آلود خنجر اس کے ہاتھ میں پکے ہوئے پھل کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ دہشت زدہ الہام ہمت کر کے آگے بڑھی اور اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے خنجر اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔

بری فائٹر ان لمحوں میں بالکل اسٹل تھی اور تابانہ کے آرم لاک میں بے بس نظر آ رہی تھی۔ عدیل نے فقط تین چار فٹ کی دوری سے تاک کر اس کے سینے میں فائر مارا اور اس کی مزاحمت کا قلع قمع کر دیا۔

اندر سے دروازہ توڑے جانے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ عدیل نے تڑپ کر تابانہ کو دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بایاں پہلو دبا رکھا تھا اور خون اس کی انگلیوں کی درزوں میں سے پھوٹ کر نکل رہا تھا۔ ''الہام! ٹیچر کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھاؤ۔'' عدیل نے پکار کر کہا۔

پھر وہ مددگار لڑکی مونا کی طرف جھکا۔ رائفل کی گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور گردن کے پچھلے حصے کو پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اسے مرنے میں شاید دو تین سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔ اس کی گردن ایک طرف مڑی ہوئی تھی اور ادھ کھلی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ وہ جیسے دھند میں لپٹے سفیدے اور شاہ بلوط کے درختوں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ مزید آگے نہیں جا سکی لیکن کم از کم ان سنگلاخ دیواروں میں سے تو نکل آئی ہے۔ وقتِ رخصت چھوٹے بھائی جمیل نے جو شال عدیل کے جسم پر ڈالی تھی وہ اب عدیل کے کندھوں پر تھی۔ اس نے یہ شال کھول کر اس مددگار لڑکی کے نیم برہنہ جسم پر پھیلا دی اور جمشید خان سمیت گاڑی میں آ گیا۔ گاڑی میں گھستے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ پسٹل کے آہنی دستے کی دو تین زوردار ضربیں جمشید کے سر پر لگائیں اور اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے سیٹ پر پھینک دیا۔ تب وہ اندر ہی سے دو نشستیں کراس کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا تابانہ پچھلی نشست پر پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ خون کے قطرے تواتر سے لگژری جیپ کے فرش پر ٹپک رہے تھے۔

''تابانہ ہمت نہیں ہارنی۔ ہم اسپتال پہنچ رہے ہیں۔'' اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

تابانہ بند آنکھوں کے ساتھ بس اثبات میں سر ہلا سکی۔

جیپ کا طاقتور انجن گرجا اور وہ گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے عدیل نے مڑ کر اس پُرشکوہ و نیم تاریک عمارت کو دیکھا۔ گیٹ کے ستون پر میاں خدا بخش کے نام کی پلیٹ نظر آ رہی تھی۔ جلد ہی عدیل کو اندازہ ہو گیا کہ یہ عمارت ایک فارم ہاؤس کا حصہ ہے۔ رات کے اس پہر فارم ہاؤس کے داخلی راستے پر فقط رکھوالی کے دو کتے چکراتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جیپ کو دیکھ کر ہکا بکا سے کھڑے رہے۔ جیپ فراٹے کے ساتھ بڑی سڑک پر آ گئی۔ الہام کی کراہتی ہوئی آواز عقب سے ابھری۔ ''ٹیچر...... پلیز ٹیچر ہوش کریں، آنکھیں کھولیں پلیز۔''

پھر وہ روتے ہوئے عدیل سے مخاطب ہوئی۔ ''پاپا! دیکھیں ان کو، کیا ہو رہا ہے انہیں۔''

عدیل کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ جیپ روکتا اور اسے دیکھتا۔ وہ پوری توجہ سامنے سڑک پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ ''الہام! ان کا سر اونچا رکھو، ان کا سانس رکنے نہ پائے۔''

''پاپا! بہت خون بہہ رہا ہے...... جلدی کریں۔''

جیپ اب نسبتاً ہموار سڑک پر تھی۔ پھر کچھ فاصلے پر اسے ایسے آثار نظر آئے جن سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ موٹر وے کے آس پاس ہے۔ موٹر وے کی تیز رفتار روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جگہ اسے ایک سنگ میل نظر آیا جس پر لکھا ہوا تھا لاہور 30 کلومیٹر۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ ''مریدکے'' قصبے کے قرب و جوار میں کہیں موجود ہے۔ رخ کا تعین ہونے کے بعد اس نے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔

☆☆☆

عدیل لاہور کے ایک بہترین پرائیویٹ اسپتال میں تھا۔ تابانہ کی حالت نازک تھی۔ اس کی کچھ انتڑیاں کٹ چکی تھیں، پیٹ کے دیگر اعضا کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ اسے مکمل بے ہوشی کی حالت میں آپریشن تھیٹر کے اندر لے جایا گیا تھا۔ ایس پی عرفان اور جمیل بھی اسپتال پہنچ چکے تھے۔ عرفان شیخ نے سب سے پہلے تو خون آلود جیپ میں موجود اس نیم بے ہوش شخص کو اپنی تحویل میں لیا تھا جو برسوں سے دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔ اس کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی عرفان یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ جمشید خاں ہی ہے۔ دیگر اہلکاروں کا بھی یہی حال تھا۔ جمشید خاں کو بھی پولیس کی نگرانی میں فوراً اسپتال کے اندر پہنچایا گیا۔ ہر طرف فون کی گھنٹیاں بج گئی تھیں۔ رات کے اس آخری پہر انتظامیہ کو اس اطلاع نے ہلا ڈالا تھا کہ جمشید خاں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ لمبے ہاتھوں والا بندہ تھا۔ کسی بھی ری ایکشن سے بچنے کے لیے شہر کی پولیس کو الرٹ کر دیا گیا تھا۔ پولیس کی کئی ٹیمیں ''مریدکے'' کی طرف روانہ ہو چکی تھیں تاکہ اس فارم

ہاؤس پر ایک زوردار ریڈ کیا جا سکے جہاں سے ڈان گرفتار ہوا تھا..... اور جہاں کم از کم دو لاشیں بھی موجود تھیں۔ عرفان بھی جمشید کی کنڈی کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد مرید کے روانہ ہو گیا۔ عدیل نے اسے عمارت کا اندرونی نقشہ سمجھا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ بیسمنٹ میں کچھ بیمار لڑکیاں اور عورتیں موجود ہیں۔ قیاس یہی ہے کہ ان کی حیثیت قیدیوں کی سی ہے۔

الہام مسلسل رو رہی تھی۔ وہ بار بار عدیل سے پوچھتی تھی۔ ''پاپا! آپی بچ جائیں گی نا؟''

عدیل اسے حوصلہ دے رہا تھا اور دعا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ پولیس اہلکاروں نے حفاظت کے نقطۂ نظر سے اسپتال کے اس ویٹنگ روم کو گھیرا ہوا تھا جہاں الہام اور عدیل موجود تھے۔ اسی دوران میں ایک عورت روتی پیٹتی اور اہلکاروں کے درمیان سے راستہ بناتی عدیل اور الہام کے پاس پہنچ گئی۔ یہ تابانہ کی والدہ میڈم تنویر تھیں۔

''کیا ہوا میری تابانہ کو۔ کہاں ہے وہ؟'' وہ عدیل کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولیں۔

''آنٹی! وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کا آپریشن ہو رہا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی، آپ دعا کریں۔''

''خدا کے لیے اُسے بچا لو۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں بچوں گی۔''

عدیل نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ الہام بھی انہیں دلاسا دینے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی۔ عرفان کی ہدایت کے مطابق اس کے ماتحت اہلکار تابانہ کے لیے خون کا انتظام کر رہے تھے۔ آپریشن تھیٹر میں آنے جانے والے طبی عملے کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ صورتِ حال سنگین ہے۔

☆☆☆

قیامت کی رات گزر چکی تھی لیکن امید کی صبح ابھی طلوع نہیں ہوئی تھی۔ یوں دوپہر کا ایک بج چکا تھا مگر آپریشن تھیٹر سے نکلنے کے بعد تابانہ مسلسل بے ہوش تھی۔ دوسری طرف بڑی تیزی کے ساتھ کچھ اہم واقعات رونما ہوئے تھے۔ جب علی الصباح فجر کے وقت پولیس نے ''مرید کے'' کے اس نواحی فارم ہاؤس پر ریڈ کیا تو وہاں سے کوئی ملزم ہاتھ نہیں آیا۔ فقط دو لاشیں ملیں یا پھر بیسمنٹ میں بند سات عدد خواتین۔ وہ بہت خوف زدہ تھیں۔ اس کے علاوہ بیسمنٹ کے ہی ایک حصے سے منشیات کی ایک کھیپ بھی ہاتھ لگی۔ انڈر ورلڈ کا یہ خطرناک اسمگلر جمشید خاں قریباً دو برس سے اس فارم ہاؤس میں میاں خدا بخش کے نام سے مقیم تھا اور

کسی کو اس کی بھنک تک نہیں پڑی تھی۔ وہ اُسے بس ایک ''انگلینڈ پلٹ'' فارمر کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔

عرفان نے بڑی تندہی سے مرید کے اور گوجرانوالا کے نواح میں چھاپے مارے۔ جمشید گینگ کے تین بندے گرفتار ہوئے اور ایک بھاگنے کی کوشش میں بلندی سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ سنسنی خیز بات یہ تھی کہ بلندی سے گرنے والا یہ شخص جمشید خاں کا لاڈلا سپوت مرجان عرف جونی تھا۔ وہ جو ایک مجبور و بے بس لڑکی کے لیے زبردستی کا دولھا بننے جا رہا تھا، اپنی ناپاک خواہش سمیت راہیِ عدم ہوا تھا۔

عرفان نے برآمد ہونے والی تمام عورتوں کو دارالامان پہنچا دیا تھا اور وہاں گارڈز متعین کر دیے تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے عرفان ان میں سے ایک فریدہ نامی عورت کو عدیل سے ملانے اسپتال ہی لے آیا۔

فریدہ کی عمر 35 سے اوپر تھی۔ یقیناً کسی وقت وہ خوب صورت رہی ہو گی مگر اب مدقوق چہرے اور دھان پان سپاٹ جسم کے ساتھ قابلِ رحم نظر آتی تھی۔ اسے اگر بیمار نہیں کہا جا سکتا تھا تو صحت مند بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

پوچھ گچھ کے دوران میں اس نے ایک دو حیرت انگیز انکشاف کیے۔ اس نے بتایا کہ بیسمنٹ میں رہائش رکھنے والی ان تمام عورتوں اور لڑکیوں کی حیثیت ماضی میں جمشید خاں کی رکھیلوں جیسی تھی۔ جمشید خاں کے ساتھ ان میں سے کچھ کا تعلق سات آٹھ سال پہلے قائم ہوا تھا۔ کچھ کا چار پانچ سال پہلے اور کچھ اس کے بعد اس کے ساتھ رہی تھیں جس وقت جمشید خاں نے ان سے تعلق قائم کیا تب وہ ایسی نہیں تھیں جیسی اب نظر آ رہی تھیں۔ جمشید خاں کی بیمار صحبت نے انہیں اس حال تک پہنچایا تھا۔ یہ تھائی رائیڈرز کی مخصوص بیماری والا وہی معاملہ تھا جو اس سے پہلے بھی سننے اور دیکھنے میں آ چکا تھا۔ جمشید خاں سے قربت کا تعلق رکھنے والی ہر عورت جلد یا بدیر اس بیماری سے متاثر ہو جاتی تھی۔ بظاہر وہ مریض نظر نہیں آتی تھی، تھوڑا بہت کھاتی پیتی بھی تھی مگر اس کا وزن بتدریج کم ہوتا چلا جاتا تھا۔ کچھ مریضوں میں ہر طرح کی خواہشات ختم ہونے لگتی تھیں۔

عدیل نے پوچھا۔ ''تو جمشید خاں نے تمہیں وہاں کیوں رکھا ہوا تھا؟''

''وہ ہمیں آزاد کر کے اپنے لیے کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔'' وہ دکھی آواز میں بولی۔

''ویسے کسی وقت خیال آتا ہے کہ وہ ہمیں جان سے بھی مار سکتا تھا مگر شاید اپنے تئیں وہ ہمارے ساتھ مہربانی والا

سلوک کر رہا تھا۔ یعنی ہمیں زندہ رکھا ہوا تھا اور ہماری تمام تر ضروریات پوری کر رہا تھا۔‘‘

عرفان نے پوچھا۔ ’’مونا نام کی جو لڑکی فارم ہاؤس میں ماری گئی، اس کا کیا ماجرا ہے؟‘‘

فریدہ نے گہری سانس لی۔ ’’جہاں تک میں جانتی ہوں وہ جمشید خاں کے بیٹے جونی سے خوف زدہ تھی۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’جمشید خاں اپنے ساتھ اکثر دو تین فی میل گارڈز بھی رکھتا تھا مگر اس نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ان گارڈز کے ساتھ کسی قسم کا جسمانی تعلق قائم نہیں کرتا تھا۔ وجہ یقیناً یہی ہو گی کہ وہ انہیں صحت مند دیکھنا چاہتا تھا۔ مونا اور بری لڑکی چوہدن کے معاملے میں بھی یہی بات تھی مگر جمشید کا بیٹا جونی...... مونا پر بُری نظر رکھے ہوئے تھا۔ باپ کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کے درپے تھا۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ اُس کے ڈر سے وہ باغی ہوئی۔‘‘

’’بالکل ایسا ہی ہے جی...... کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی...... جب مونا نے دیکھا کہ اسے اس چنگل سے نکلنے کے لیے راستہ مل رہا ہے تو وہ آپ لوگوں کی مدد پر آمادہ ہو گئی لیکن......‘‘ فریدہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔

عدیل کی نگاہوں میں بھی وہ منظر گھوم گیا جب رائفل کی طاقتور بلٹ لگنے کے بعد وہ پورچ کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی اور دھند میں لپٹے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مزاحمت اور پھر آزادی کا سفر کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی ختم ہوا تھا۔

☆☆☆

تابانہ کے آپریشن کو 72 گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ مسلسل آئی سی یو میں تھی۔ کسی وقت وہ ہوش میں بھی آ جاتی تھی مگر اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔ اس کی والدہ اور جمیل مستقل طور پر اسپتال میں اس کے ساتھ تھے۔ اس کے ایک ماموں جو فزیوتھراپسٹ تھے، وہ بھی آ جا رہے تھے۔ شام کو الہام اور عدیل پھر اسپتال پہنچے۔ جمیل نے بتایا کہ وہ اس وقت ہوش میں ہے۔ الہام اسے دیکھنے کے لیے تین روز سے بے تاب تھی۔ اس روز جمیل نے کوشش کر کے اسے ملا دیا۔

کوئی دس منٹ بعد الہام آنسو بہاتی ہوئی واپس آئی...... اس نے عدیل کو بتایا کہ انہیں آکسیجن لگی ہوئی ہے۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ عدیل کی طرف دیکھ کر بولی۔ ’’پاپا! وہ بہت اچھی ہیں۔ دیکھیں اس حالت میں بھی انہیں آپ کا خیال ہے۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں...... مجھے بہت افسوس ہے پاپا کہ ہم نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔‘‘

عدیل اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔

وہ کہنے لگی۔ ’’پاپا! وہ صرف میری خاطر، اپنی رضامندی سے اس منحوس فارم ہاؤس میں پہنچی تھیں۔ وہاں...... ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری خاطر انہوں نے ان لوگوں کی اتنی سخت مار پیٹ برداشت کی...... اور پاپا، میری اور آپ ہی کی خاطر وہ اس وقت ایسی حالت میں پڑی ہیں۔‘‘ ایک لمحہ توقف کر کے اس نے ٹشو سے اپنی سرخ ناک پونچھی اور بولی۔ ’’وہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب ہم نکل کر پورچ میں پہنچے، وہ حملہ آور لڑکی آپ کو بہت نقصان پہنچا سکتی تھی اگر ٹیچر کو اس کے سامنے آنے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی ہو جاتی تو وہ کامیاب ہو جاتی۔ آج اگر آپ میری نظروں کے سامنے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اللہ کے بعد ٹیچر کا شکر گزار ہونا چاہیے۔‘‘

عدیل، الہام کو اپنے ساتھ لگا کر تھپکنے لگا۔

’’پاپا۔‘‘ اس نے عجیب آہنگ میں کہا۔ ’’وہ...... آپ کو پسند کرتی ہیں پاپا۔ بہت زیادہ۔ کوئی کسی کے لیے اپنی جان اس طرح خطرے میں کب ڈالتا ہے...... آپ کو انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھیں مگر مکمل کر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔‘‘ پھر اس نے عدیل کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے کہا۔ ’’پاپا! یہ حادثہ ہونے سے پہلے ممی میرے خیالوں میں آتی تھیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا، وہ بالکل میرے ساتھ کھڑی ہیں۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں میرا اور دوسرے میں ٹیچر کا ہاتھ تھام رکھا ہوتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح ٹیچر کو چاہتی ہیں۔ مم...... مجھے اور ٹیچر کو...... ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہیں۔‘‘ عدیل بس اس کا سر سہلاتا رہا۔

یہ اس سے تیسرے روز کی بات ہے۔ تابانہ کی والدہ اسپتال کے برآمدے میں جائے نماز بچھائے سربسجود تھیں۔ عدیل لابی میں تھا۔ کالج کے دو لڑکے اسے بحیثیت باکسر پہچان کر اس کے قریب آن بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ چیمپئن باکسر بالکل فٹ نظر آتا ہے اور وہ شاید اسے پھر سے باکسنگ کے رِنگ میں دیکھ سکیں اور یہ خواہش صرف ان لوگوں کی ہی نہیں تھی بے شمار شائقین ایسے تھے جو اس عمر میں بھی اسے رِنگ میں دیکھنا چاہتے تھے...... فرنٹ مین ظہور ہاوا کی گرفتاری سمیت جو کچھ بھی گینگسٹر جمشید خاں کے ساتھ ہوا تھا وہ سب

میڈیا کی زینت بن چکا تھا۔ یہ سب کچھ بہت حیرت ناک تھا مگر اس میں سب سے حیرت ناک بات یہی تھی کہ عدیل جو ایک اَن چاہے مقابلے کے بعد بستر پر جا پڑا تھا اب معجزانہ طور پر تندرست نظر آرہا تھا۔ اپنی اندرونی پریشانی کو دبا کر عدیل لڑکوں کے سوالات کے جواب دے رہا تھا جب جمیل تیز قدموں سے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر رنج اور تشویش کے سائے تھے۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''بھائی جان! اسے سانس ٹھیک سے نہیں آرہی۔ وہ آپ سے ملنا چاہ رہی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اجازت لی ہے۔''

اب عدیل بھی اُس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ کم از کم ایک بار تو ملنا چاہ رہا تھا۔ وہ بھرے ہوئے دل کے ساتھ اٹھا۔ ایک نرس نے اسے مخصوص سبز گاؤن پہنایا اور وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں داخل ہوگیا۔ وہ اپنے ڈیانا کٹ بالوں کے ساتھ بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ آکسیجن کے علاوہ اسے اور کئی نالیاں لگی ہوئی تھیں۔ چہرے کی سوجن جس نے اسے بدشکل کردیا تھا اب کافی حد تک کم ہوچکی تھی مگر آنکھوں کے اندر سنگین سائے گہرے ہوگئے تھے۔

عدیل اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ عدیل کی طرف بڑھایا، جیسے چاہ رہی ہو کہ وہ اسے تھام لے۔ عدیل نے ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنا ماسک سرکایا۔ اس کے زرد خشک ہونٹوں پر ایک دھیمی مسکان بکھر گئی۔ بہت ہلکی آواز میں بولی۔ ''سر! سارے پرستار تو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ میرے جیسے بھی ہوتے ہیں۔ اب پرستاروں سے دور رہنا چھوڑ دیجیے گا۔''

''ایسی باتیں مت کرو تابانہ۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ وہ کہتا ہے، تم کو جلد اچھا ہوجانا ہے۔''

''آپ بہت بچے ہیں سر! سب کچھ آپ کے چہرے پر آجاتا ہے۔ آپ کو تو جھوٹی تسلی دینا بھی نہیں آتا۔''

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''تابانہ! میری سمجھ میں نہیں آتا، میں تم سے کن لفظوں میں معافی مانگوں۔ میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔''

''چیمپئن اور اسٹارز تو معافی نہیں مانگا کرتے۔ معافی تو پرستار مانگتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی نادانیوں سے آپ کو بہت پریشان کیا۔ آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ آپ کے لیے مشکلات کھڑی کیں۔ مجھے معاف کردیجیے گا۔'' وہ کراہ کر بولی۔

''پلیز تابانہ! ایسی باتیں مت کرو۔ اپنے ٹھیک ہونے کی باتیں کرو۔ تمھیں ٹھیک ہوجانا ہے۔''

اُس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ایک شرط پر ایسی باتیں نہیں کروں گی...... پوچھیں کیا شرط ہے؟''

''کیا ہے؟''

''الہام دو چار برس میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر اپنے گھر جانے والی ہے۔ اس کے جانے سے پہلے یا جانے کے فوراً بعد آپ شادی کرلیں گے۔'' تابانہ کا انداز وعدہ لینے والا تھا۔

وہ بس خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''ایک بات اور...... آپ یہ شادی اپنی کسی پرستار سے کیجیے گا...... کسی بھی پرستار سے۔ دیکھنا وہ آپ کو پھولوں کی طرح رکھے گی۔ آپ پر نثار رہے گی۔''

عدیل نے ایک دکھی سانس لی۔ بڑے دھیان سے سفید بستر پر پڑی تابانہ کو دیکھا۔ ان لمحوں میں اس کے دل کے اندر جیسے ایک سوتا سا پھوٹ پڑا۔ سوز و گداز کے رنگ میں رنگا ہوا ایک نایاب پانی نمودار ہوا اور اس کی رگوں میں داخل ہوکر خون کے ساتھ پورے جسم میں پھیل گیا۔ اس کا دل ایک دم ہی کسی اور انداز سے دھڑکنے لگا۔ اسے اس دیوانی سی لڑکی پر ایک دم ہی ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

اس نے تابانہ کے ہاتھ کو ہولے سے دبا کر کہا۔ ''سچی ''پرستار'' ڈھونڈنا کافی مشکل کام ہے تابانہ...... نئی پرستار ڈھونڈنے کے بجائے کیوں نا اسی کے بارے میں سوچا جائے جو ہے۔''

وہ خالی، خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ اس نے پھر اس کا ہاتھ دبایا۔ ''ایک دن تم نے کہا تھا، تم میری ہر بات مان سکتی ہو۔ ہر بات چاہے نہ ماننا۔ اس کو پہلی اور آخری بات سمجھ کر مان لو۔ ٹھیک ہوجاؤ تابانہ! اپنی بیماری کو شکست دے دو۔''

اس کا رنگ مزید سفید پڑ گیا۔ آنکھوں میں گہرا کرب جاگ گیا۔ عدیل کو یوں لگا جیسے اس نے یکایک اس پر ایک بہت بھاری بوجھ ڈال دیا ہے...... اس بوجھ سے وہ سرتاپا لرز گئی ہے۔ ایک دم اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ سینے سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ عدیل نے جلدی سے آکسیجن ماسک اس کے منہ پر چڑھا دیا۔ کھانسی سے اس کے پہلو کے ٹانکے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر لپکتی ہوئی اندر آئی۔ عدیل کو ذرا جھڑک کر بولی۔ ''آپ سیانے بیانے ہوکر اپنے مریض کے لیے مشکلات پیدا کررہے ہیں۔ پانچ منٹ کی اجازت تھی، آپ دس منٹ سے یہاں موجود ہیں۔''

عدیل ''سوری'' کہتا ہوا الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اس کے بعد عدیل کبھی اسپتال نہیں گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے تابانہ سے جو کہنا تھا، وہ کہہ دیا ہے۔ اب جو ہونا ہے اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ..... کرشموں اور معجزوں پر بھی کسی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ اوپر والے کی مرضی سے رونما ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ اس کی کمر ٹھیک ہونے والا واقعہ بھی تو کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ (جمشید گینگ کی بربادی اور کم از کم 40 افراد کے قاتل جمشید کا اچانک قانونی شکنجے میں آنا بھی تو معجزہ ہی تھا)

تابانہ کے زخموں کے انفیکشن کے لیے جو کچھ ڈاکٹرز سے ہو رہا تھا، وہ کر رہے تھے۔ عدیل نے جمیل اور الہام سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ تابانہ کے بارے میں اسے کوئی خبر نہ دیں...... وہ بس اس کے لیے دعا کر رہا تھا۔ جمیل ہمیشہ سے عدیل کا مزاج شناس اور رازداں تھا۔ وہ اس کی دلی کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے اسپتال میں تابانہ کی نگہداشت کی پوری ذمّے داری خود اٹھالی تھی اور عدیل کے لیے ''اسپتال'' کے حوالے سے بلیک آؤٹ کر دیا تھا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا تھا کہ الہام زبردستی اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ اس سے لپٹ گئی تھی لیکن اس کے آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے عدیل کو اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا تھا۔ ''پاپا! ٹیچر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''وہ ٹھیک ہیں؟''

''آپ خود آ کر دیکھ لیں۔''

عدیل اس کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا اور اسے پھر بے طرح چونکنا پڑا تھا۔ تابانہ گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔ جمیل اور عرفان اسے سہارا دے کر وہیل چیئر سے اتار رہے تھے...... صوفے پر بٹھا رہے تھے۔ اس کا چہرہ زرد تھا مگر ہونٹوں پر مسکان تھی۔ اس کی والدہ بھی ہمراہ تھیں۔

''بڑی ضدی ہے یہ۔'' اس کی والدہ نے کہا۔ ''کہہ رہی تھی پہلے اپنے گھر نہیں جاؤں گی، الہام کے گھر جاؤں گی۔ عدیل صاحب کو سلام کروں گی۔''

عدیل کتنی ہی دیر سکتہ زدہ سا کھڑا رہا۔ ''تھینکس گاڈ۔'' اس نے کہا پھر جلدی سے واپس چلا گیا۔ وہ ایک چیمپئن باکسر تھا۔ اس کا ایک ''امیج'' تھا۔ اسے پسند نہیں تھا کہ کسی کے سامنے اس کی آنکھوں میں نمی آئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ خود کو سنبھال چکا تو الہام اندر داخل ہوئی۔ اب وہ اپنے آنسو پونچھ چکی تھی اور اس کا چہرہ اوس میں دھلا ہوا گلاب نظر آتا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک خوش رنگ بوکے تھا۔

''یہ کس لیے ہے؟'' عدیل نے پوچھا۔

وہ عجیب انداز میں بولی۔ ''اس کے لیے پاپا جس نے آپ کے کہنے پر اپنی زندگی اور موت کی جنگ جیتی ہے۔ اپنی بیماری کو ایسی یادگار ''رزس ٹینس'' (مزاحمت) پیش کی کہ ڈاکٹرز بھی حیران رہ گئے۔ ہاں پاپا! پچھلے دس بارہ دنوں میں مس تابانہ نے اپنی ''ون پاور'' کی مدد سے ایک انہونی کر دکھائی ہے۔''

عدیل ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''جایئے پاپا...... پلیز اپنے ہاتھوں سے یہ پھول ان کو دیجیے۔ کمرے میں اب کوئی نہیں، وہ اکیلی ہیں۔''

اپنے لاڈلے پن سے اس نے عدیل کے تذبذب کو دھکیل دھکیل کر ایک کونے میں کر دیا۔ عدیل بوکے لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ عدیل کو دیکھ کر اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ عدیل نے اسے روک دیا۔ بوکے اس کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ نم نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی...... دیکھتی رہی۔ پھر نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ کی بات مان لی نا۔'' اس کا اشارہ اپنی صحت یابی کی طرف تھا۔

''شکریہ تابانہ۔''

''لیکن آپ کی دوسری بات مجھے بہت بُری لگی۔''

''کون سی؟''

''آپ نے کہا تھا میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ کہہ رہا ہوں...... آپ نے آخری بار کیوں کہا؟'' تابانہ کے لہجے میں دنیا بھر کے شکووں کی ناراضی یکجا ہو گئی تھی۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''ٹھیک ہے تابانہ! وہ آخری بات نہیں تھی۔ میں ایک دو گزارشات تم سے اور بھی کروں گا۔'' اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ چمک گئی۔

کمرے کی خاموشی میں جیسے ایک ساز سا بج اٹھا تھا۔

وہ اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''ایک دو گزارشات نہیں جناب، میں چاہتی ہوں آپ مجھ سے بہت سی باتیں کہیں اور میں بہت سی باتیں مانوں...... بس مانتی چلی جاؤں۔''

کھڑکیوں سے باہر کئی دنوں کی دُھند اور ابر آلود سردی کے بعد اچانک ہی سورج اپنا چہرہ دکھانے لگا تھا...... ایک سنہری دھوپ...... اداس، یخ بستہ در و دیوار کو گرمانے جا رہی تھی۔

❖❖❖